سہ ماہی

ھمگام

اپریل ، مئی، جون ۲۰۱۶ جلد نمبر : تین ، شمارہ نمبر: دو

رابطہ

ای میل humgaam@ymail.com

ویب سائٹ Www.humgaam.net

دفتر

ہمگام پریس، نوری نصیر خان روڈ۔

گوادر، بلوچستان

ناشر: ہمگام پریس

فہرست

1)ھمگام شخصیت.....(3

2) تحریکی تقاضے اور ہماری سوچ کا محور..... بشیر زیب(4

3)پنجابی سامراج کا تعلیمی نصاب..... منجر وگٹ(6

4)بلوچ قومی تحریک: عسکری وسیاسی ڈسپلن..... شبیر(9

5)ھمگام انٹرویو.....(12

6)توار کا صحافتی سفر..... خادم(18

7) The Battle over Balochistan's Ports.....Shahzavar(31

ہمگام شخصیت

بسمارک

تمام اقوام میں ایسے منفرد افراد گزرے ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت، علم اور جدوجہد سے اپنی قوم و ملک کی تقدیر بدل دی۔ بسمارک انہی افراد میں سے ایک ہے۔اوٹووون بسمارک یکم اپریل ۱۸۱۵ کو ایک ممتاز زمیندار اور فوجی افسر کارل ولیئم کے گھر پیدا ہوا۔ بسمارک کی سوانح نگار جوناتھن اسٹین برگ کے مطابق بسمارک نے جرمنی تو بنایا مگر اس نے کبھی بھی اس پر حکومت نہیں کی۔ اس نے تین پروشین باشاہوں کے ماتحت پروشیا حکومت کی سربراہی کی جو کہ کسی بھی وقت بلا جھجک بسمارک کو اسکے عہدے سے فارغ کر سکتے تھے۔ آج سے ایک سو پینتالس سال قبل جرمنی ستائیس چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سب سے طاقتور ریاستیں پروشیا اور آسٹریہ تھیں اور یہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ ۱۸۵۱ میں پروشیا کے بادشاہ فرڈیننڈ ولیئم چہارم بسمارک کو جرمن کنفیڈریشن میں اپنی ریاست کا نمائندہ مقرر کرتے ہیں۔اس کے بعد بسمارک روس اور فرانس میں پروشیا کے سفیر مقرر کیے جاتے ہیں۔ نئے بادشاہ ولیئم اول نے ۱۸۶۲ میں بسمارک کو ترقی دے کر پرویشا کا چانسلر یعنی وزیر اعظم مقرر کیا۔ پروشیا کا وزیر اعظم مقرر ہوتے ہی بسمارک اپنی زندگی کے سب سے بڑے مقصد یعنی متحدہ جرمن ریاست کی تشکیل پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بسمارک نے طاقت میں رہتے ہوے دوسرے سیاست دانوں کی طرح کبھی بھی لوگوں کے بڑے ہجوم سے خطاب نہیں کیا کیونکہ اس کی توجہ ہمیشہ سرکاری اداروں کی نٹ اور بولٹ پر ہوتی تھی۔ کتاب، بسمارک: ایک زندگی کے مطابق بسمارک اپنے زیر دست کام کرنے والے لوگوں کو مکمل کنڑول کیا کرتے تھے اور وہ اپنے سخت رویے کی وجہ سے جابر اور ایک آمر کہلاتے تھے شاید بسمارک کا مزاج، اس کا رویہ اور انداز کسی سے میل نہیں کھاتا تھا، وہ دوسروں سے مختلف تھا اسی لیے وہ کامیاب تھا۔

مارکسزم اور جدید کمیونزم کے بانی جرمن باشندے کارل مارکس بھی بسمارک دور میں جرمنی میں تھے لیکن وہ بسمارک کے مخالف اور انکے سیاسی پروگرام کے خلاف تھے۔ بسمارک جرمنی کی سیاسی روایات جیسے کہ بادشاہی نظام کے حق اور ایک متحدہ جرمن ریاست پر یقین رکھتا تھا، اس کی سیاست قوم پرستی، رسم و رواج اور حقیقت پسندی کے گرد گھومتی تھی جبکہ کارل مارکس انقلاب کے ذریعے مزدوروں کی حکمرانی چاہتا تھا۔ مارکس کے نزدیک نیشنلزم ایک ناسور ہے اور وہ اپنی تصوراتی دنیا میں قوم کے بجائے طبقوں کو تاریخ کا پہیہ سمجھتا تھا۔ بسمارک نے اپنی جرمن سرزمین کو متحد کرنے لیے کئی جنگیں چھیڑیں اور کئی جنگوں کو رکوایا۔ چھوٹی چھوٹی شاہی ریاستوں میں تقسیم جرمنی کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے ہمسایوں سے تھا جو جرمنی کی کمزوریوں کو سمجھتے تھے۔ جرمن قوم کے کچھ علاقوں پر ڈنمارک کا قبضہ تھا بسمارک نے اپنے سب سے بڑے جرمن حریف آسٹریا کو اپنے ساتھ ملایا اور جرمن علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے ڈنمارک سے جنگ چھیڑ لی۔ بسمارک جرمن علاقے پھر سے جرمن سرزمین میں شامل کر لیتا ہے اور ڈنمارک کو شکست ہوتی ہے۔اس کے بعد جب آسٹریا پروشیا کے لیے مسئلے پیدا کرتا ہے تو بسمارک آسٹریا سے جنگ چھیڑ دیتا ہے اور دوسری طرف اٹلی کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ جنگ کے دوران بسمارک کے سیاسی مخالف اس پر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں لیکن اس حملے میں بسمارک کو فقط معمولی زخم آتے ہیں اور اس جنگ میں جیت پھر سے بسمارک کی ہوتی ہے۔ آسٹریا کو شکست دینے کے بعد فرانس کے سربراہ نپولیئن سوئم (جو کہ نپولیئن اول کے بھتیجے تھے) پروشیا کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو کر پروشیا کی سربراہی میں قائم شمالی جرمن ریاستی اتحاد پر حملہ کرنے کے لیے اعلان جنگ کر لیتا ہے۔ اس علان سے تمام جرمن قوم کے نذدیک فرانس ایک جارحیت پسند حملہ آور کے طور پر اُبھرتا ہے۔ تمام جرمن ریاستیں پروشیا کی سربراہی میں اپنی سرزمین کی حفاظت کے لئے جنگ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بسمارک کی سربراہی میں پروشیا فرانس کو بھی اپنی حکمت عملی سے شکست سے دوچار کر لیتا ہے۔ اس جنگ کے بعد بسمارک جرمن ریاستوں کو متحدہ طاقت بنانے کے لیے ایک جرمن ریاست کی تشکیل پر کام شروع کرتا ہے۔ بلا آخر ۱۸ جنوری ۱۸۷۱ کو آسٹریا کے علاوہ تمام جرمن ریاستیں ولیئم دوئم کی سربراہی میں جرمن سلطنت کی بنیاد رکھ لیتے ہیں۔ جرمن سلطنت قائم ہونے کے چند سال بعد بسمارک اور بادشاہ کے درمیان پالیسی پر اختلافات جنم لیتے ہیں جس پر بسمارک اپنے عہدے سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔

جرمنی چند ہی سالوں میں یورپ کی طاقت بن جاتی ہے، بسمارک، متحدہ جرمنی کا بانی اور جرمن قوم کا ہیرو تیس جولائی ۱۸۹۸ کو انتقال کر لیتے ہیں۔ بسمارک ایک عظیم اسٹیٹ مین تھا جسکی جنگ و خارجہ حکمت عملی اور انداز سیاست کو سمجھنے کے لیے جرمن دانشوروں کو ایک نیا لفظ Realpolitik ایجاد کرنا پڑا جسکے معنی ہیں حقیقت پسندی کی بنیاد پر سیاست کرنا۔ بسمارک کی موت کے بعد بھی جرمن قوم بسمارک کی گن گاتی ہے۔ ہٹلر جنگ جہانی دوم میں اپنی سب سے طاقت ور بحری جہاز کو بسمارک کا نام دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بیس ویں صدی میں جرمنی شدید بحران کا شکار تھی اور ان کو کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تو جرمن کہا کرتے کہ ۔۔۔۔۔۔ اگر بسمارک ہوتا تو وہ کیا کرتا؟؟

تحریکی تقاضے اور ہماری سوچ کا محور

بشیر زیب بلوچ

میری اپنی ذاتی رائے ہے جس سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس دفعہ بلوچ قومی تحریک خدانہ کرے ماضی کی طرح سرد مہری کا شکار ہوا تو اس کی بنیادی وجہ نہ، دشمن کی ظلم وجبر، نہ وسائل کی کمی، نہ قومی اور بین الاقوامی حالات اور مواقع کی ناموافقی، نہ بلوچ قوم خاص کر نوجوانوں میں بے حسی و بیگانگی، نہ جذبہ قربانی کا فقدان، نہ خوف نہ آسائش وغیرہ ہونگے، بلکہ اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف ہماری بچگانہ، محدود اور سطحی سوچ، غیر ذمہ داری، غیر سنجیدگی سنی سنائی باتوں پر ایمان لانے والی سوچ سے لیکر ضد ہٹ دھرمی وغیرہ ایسے دستیاب رویے ہیں جو موجودہ حالت اور بلوچ قومی تحریک برائے آزادی اور قومی بقاء کیلئے زہر قاتل ہیں۔

صرف ایک خوبصورت تصور کو لیکر دن رات طوطے کی طرح رٹہ لگانا آزادی آزادی پنجابی دشمن وغیرہ اور اس فرق اور پیمانہ سے لاعلم ہونا کہ ہماری کون سی عمل واقدام سے بلوچ قوم یا دشمن کو فائدہ و نقصان ہوگا پھر کیا ایسی سوچ کی موجودگی میں آزادی جیسے انمول نعمت کو حاصل کرنا ممکن ہوگا۔ جذباتی پن اور ذاتی خواہشات کی پیش نظر تحریکی تقاضوں اور اجتماعی قومی مفادات، دشمن کی ہر نئے دن، نئے حربے اور چلینجز کی ادراک رکھنے کے بجائے مکمل غفلت کا سماں ہے۔

جب تک قوم میں غلامی کے خلاف نفرت اور آزادی کی چاہت کے فکر و نظریہ کے علاوہ دشمن کی ہر مکاری، چال، جبر اور سازشوں سے قوم کو مکمل اور موثر حکمت عملی کے تحت آگاہی شعور و علم مہیا نہ کرنا قوم میں آزادی کی احساسِ امید کے ساتھ دشمن کے خلاف نفرت اور بیداری و قومی عمل میں حصہ داری کی رجحان کو پروان چڑھنا مشکل ہے۔

میرے خیال میں کئی وجوھات کے باوجود غیر ذمہ داری ،غیرسنجیدگی ،ضد ،کم علمی ، نالائقی اور محدود و سطحی سوچ جیسے منفی رویوں کا پلڑا بھاری ھے۔

پھر کیا آج ہمارے پاس ایسا واضح اور تسلسل کے ساتھ جاری کوئی سیاسی پروگرام یا منصوبہ بندی موجود ہے، اگر موجود ہے بھی اس پر کتنی حد تک عمل درآمد ہو رہا ہے؟

پنجابی آج سے نہیں، بلکہ عرصہ دراز سے اپنی قومی مفاد کو مد نظر رکھ کر ہماری نسل کشی کر کے بلوچ گلزمین کی اہمیت اور افادیت سے لیکر وسائل کی لوٹ کھسوٹ کی عزائم اور پالیسی کو وسعت دینے کی خاطر عالمی قوتوں سے لیکر علاقائی قوتوں کے ساتھ اپنے ناجائز ذرائع اور رشتوں کو کوئی بھی نام و شکل دیکر جائز قرار دیکر مضبوطی کے ساتھ استوار کر رہا ہے۔

مثلاً پنجابی قوم اپنی مفاد اور قومی مقصد کے خاطر نام نہاد اسلامی ملک اور مسلمان قوم کی من گھڑت اور بوسیدہ دلیل کے نام پر پشتون، سندھی اور بلوچوں کو متحد کر کے بلوچوں کے خلاف اکٹھا کر کے زیر کر سکتا ہے۔ دوسری جانب چین جیسے غیر مسلم ملک کو ہمسایہ ملک کا نام دیکر چین کے ساتھ ملکر عالمی سطح پر بھی اپنی قومی مفادات کو وسعت دے سکتا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ افغانستان جیسے مسلم ملک اور حقیقی اور جائز ہمسایہ کو ازل سے اپنی مفاد کے خاطر خون آلود اور بربادی کے دھانے پر رکھا ہوا ہے۔ لیکن بلوچ قومی تحریک ایک قوم، ایک سرزمین، ایک سوچ ایک مقصد، ایک ہی قومی مفاد اور جائز رشتہ کو لیکر متحد نہیں ہو سکتا ہے۔

میرے خیال میں کئی وجوہات کے باوجود غیر ذمہ داری، غیر سنجیدگی، ضد، کم علمی، نالائقی اور محدود و سطحی سوچ جیسے منفی رویوں کا پلڑا بھاری ہے۔

مختلف خیال، ماحول، تربیت اور مزاج کو لیکر جب لوگ قومی آزادی کی فکر کی بنیاد پر تحریک میں شامل ہوتے ہیں، جب مضبوط اور سخت ڈسپلن کی بنیاد پر تنظیم نہیں ہوگا تو پھر مختلف مزاج اور سوچ کے لوگوں کے درمیان ضرور کئی چیزوں اور جگہوں پر تضادات کا جنم لینا فطری حقیقت ہوگا، پھر مضبوط اور سخت اصولوں پر کاربند تنظیم ہی فطری تضاد کو بجائے انتشار خلفشار یا بحران تک لے جانے سے پائیدار حل نکال کر مختلف خیال و مزاج کے لوگوں کو دلیل علم اور شعور سے لیس کر کے سب کو ہم خیالی پر گامزن کر دے گا۔ پھر تضادات اور اختلافات اس وقت تک ہونگے اور ہوتے رہیں گے جب تک بلوچ قوم اپنی آزادی تک محو سفر ہے۔

لیکن معمولی سے غیر معمولی تضادات پر بروقت قابو پانا ان کا مستقل اور موثر حل نکالنا مضبوط تنظیم میں مضبوط اور دوراندیش قیادت کا فرض ہوتا ہیں۔

بصورت تضادات آخر کار بحران اور مایوسی کی روپ اختیار کر لینگے پھر ان پر قابو پانا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔ آج کوئی ذی شعور بلوچ قومی تحریک میں بنیادی مسائل، تضادات اور کمزوریوں سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تحریکوں کے حصہ تھے اور آگے بھی حصہ ہونگے کوئی مایوسی اور پریشانی کا مقام نہیں ہے۔ لیکن ان تضادات کی موجودگی پھر ان کا حل اور طریقہ کیا ہونا چاہیے ؟؟

تضادات کی نشاندہی یا تضادات کو بیان کرنا آسان ہے تضادات کو صحیح سمجھنا اور ان کا موثر حل نکالنا ناممکن نہیں بلکہ مشکل ضرور ہے۔ تضادات کے حوالے سے مختلف آراء میں سے دو رائے اکثر ذہنوں میں پائے جاتے ہیں

"اول" بلوچ قوم مایوس ہو رہا ہے

" دوئم" دشمن فائدہ اٹھا رہا ہے۔

میری رائے کے مطابق بلوچ قوم اس وقت بالکل مایوس ہوگا اور دشمن بھرپور انداز میں فائدہ اٹھائے گا، جب تضادات کو حل یا اصلاح کیلئے ظاہر کرنے یا تعمیر کیلئے کچھ چیزوں میں تخریب کے فارمولہ کے تحت عمل کرنے کے بعد بھی کوئی حل، اصلاح اور تعمیر ممکن نہ ہو۔ یعنی ویسے کے ویسے چلتے رہے۔ پھر دشمن اور اس کے ایجنٹ تیزی اور آسانی کے ساتھ سیاسی و تحریکی تضادات کو لیکر مختلف رنگ و روپ میں پیش کر کے بلوچ قوم میں تحریک کے حوالے سے مایوسی کے عمل کو پھیلا دیگا

پھر کیا تحریکی تضادات کمزوریوں، خامیوں اور مسائل پر جاری تسلسل کے ساتھ بحث مباحثہ کے بعد ہمارے پاس جامع اور مستقل واضح حل موجود ہے؟

اگر ہے بھی کیا اس پر تیزی اور سنجیدگی کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں؟ یا ایک طرفہ پیش رفت دوسری طرف خاطر خواہ جواب کا فقدان ہے؟ فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ جو کہ قبل از وقت ہے۔

کیا ہم بنیادی تضادات سے ہٹ کر اب معمولی غیر ضروری سطحی چیزوں پر لٹک نہیں رہے ہیں، کیا اصل تضادات مسائل نظر انداز نہیں ہو رہے ہیں؟

کیا اب ہم، تو تو، میں میں، ایسا ہوا، کیوں ہوا، کیسا ہوا، خاندانی و گھریلو گلے شکوے کی طرح سیاسی و علمی بحث مباحثہ سے بیگانگی اور رو گردانی اختیار نہیں کر رہے ہیں؟

کیا آج ہم مکمل سوشل میڈیا کو بلوچ قوم کی مستند رائے، اظہار، دلیل، سوچ، موقف کے ساتھ شعور، زمینی حقائق کی عکاسی نہیں سمجھتے ہیں جو میرے خیال میں غلط فہمی اور خوش فہمی پر مبنی زمینی حقائق کے مکمل برعکس ہے، یا پھر سوشل میڈیا کو بلوچ قوم میں قومی شعور، بیداری اور آگاہی کا مکمل اور موثر جامع سمجھنا زمینی حقائق سے بیگانگی کے مترادف ہے۔

کیا آج ہم مخصوص اور محدود سرکلز ماحول کی رائے، سوچ اور معلومات کو لیکر بلوچ قوم کی رائے اور سوچ تصور لیکر حقیقت کی منافی اور غلط اندازہ نہیں ہوگا؟ جو تحریک کیلئے نقصاندہ عمل نہیں ہوگا؟ کیونکہ تحریکی فیصلہ اگر مخصوص رائے یا غلط اندازوں پر مبنی آراء پر ہوئے تو فیصلہ بجائے تحریک کو کامیابی کی طرف لے جانے کے ناکامی کی طرف دھکیل دے گا۔

کیا آج ہم گمنام اور من گھڑت پروپیگنڈوں اور سنی سنائی غیر ضروری آراء اور سطحی چیزوں کو اہمیت اور ترجیح دیکر جلد متاثر نہیں ہو رہے ہیں۔؟

اس تمام صورتحال کو سامنے رکھ کر زمینی حقائق اور تحریکی تقاضات سے لیکر دشمن کی شدت کے ساتھ بے رحم سفاکی اور قوم میں خوف و ہراس کے ماحول کو پھیلانے، دشمن کو موثر جواب دینے کیلئے موثر اقدام کی خاطر بلوچ آزادی پسند قوتوں کو سنگت حیربیار کی طرف سے پیش کردہ فارمولہ اتحادی واشتراکی عمل پر سوچنا ہوگا تاکہ شعوری طور پر سوچ بچار کے بنیاد پر اصولی اتحاد قائم ہو۔

بصورت دیگر دشمن ایک ایک کر کے وقتی طور ہر ڈیڑھ انچ کے مسجدوں کو مسمار کر دیگا۔ گو کہ میرا ایمان ہے تحریک مکمل ختم نہیں ہوتے لیکن وقتی طور پہ دب ضرور جاتے ہیں اور پھر دوبارہ تحریک کو فعال اور موثر بنانا موجودہ تحریک سے کمزوریوں کو ختم کرنے سے بہت مشکل عمل ہوگا۔

پنجابی سامراج کا تعلیمی نصاب اور بلوچ نونہالوں کا مستقبل

منجرو گٹ بلوچ

کنفیوشس جو کہ ایک سکالر ہے کا کہنا ہے کہ اگر آپ دس سال کی سوچ رہے ہو تو ایک بیج لگادو۔ اور اگر سو سال کا سوچ رہے ہو تو ایک درخت لگادو۔ اگر ہمیشہ کے لئے آپ نے منصوبہ بندی کرنی ہے۔ تو لوگو کو تعلیم دو۔ حقیقت پسند قوم دوست اپنے گردو پیش کا جائزہ لیں کہ اس دانشورانہ لائن پر کون عمل پیرا ہو کر اپنے قوم کی مستقبل کو محفوظ بنا رہا ہے۔ پنجابی یا بلوچ۔؟ آج ہم اپنا جائزہ لیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ وقت کی تیز رفتاری ہمارا حال اور مستقبل کو مد نظر رکھ کر جواب یہی سامنے آتا ہے کہ اب تک پنجابی اس فلسفی کے لائن پر عمل کر رہا ہے۔ اور بلوچ ابھی تک اس ریاستی تعلیمی نصاب کو ٹنل ویژن سے دیکھ کر اس کی کم افادیت اور زیادہ نقصانات سے صحیح معنوں میں واقفیت نہیں رکھتا۔ جب واقفیت نہیں رکھتا تو یقینا ہمارے پاس حکمت عمل بھی نہیں ہو گی۔ موجودہ ریاستی تعلیمی ادارے جو کہ ہمارے بچوں کو جو بنیادی تعلیم دے رہی ہیں۔ وہ صرف رٹہ سسٹم ہی ہے۔ جس سے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفقود کیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ نظام تعلیم ایک ایسے استحصالی نظام کیلئے ترتیب دیا گیا ھے۔ جس کے ذریعئے سے قابض کے تعلیمی ادارے اس محکوم بچے میں موجود اس کی انسانیت کو مسخ کرتے ہیں۔ ہمارے نونہالوں میں موجود ان کی قومی اقدار و تہزیب کو چھین لیا جاتا ہے۔ اسے اس کی ذات تک معدود کیا جاتا ہے۔ اسے اپنے سنگت سے مقابلے کی درس دی جاتی ہے۔ نہ کہ تعاون کی۔ کسی بھی انسانی سماج میں دو طرح کی سوچیں ہوتی ہیں۔ ایک کو آرڈینیشن یا کوآپریشن دوسرا کمپی ٹیشن جہاں دوسرے کو پاؤں تلے روندھ کر اپنے بھائی سے آگے بڑھنے کا شوق پنہاں ہوتا ہے۔۔ اسے اس کی ذات تک محدود کیا جاتا ہے۔

بلوچ دشمن قابض پنجابی ریاست کی تعلیمی نصاب کے ذریعئے بلوچ کی نئی نسل سے اس کی قوم، سرزمین قومی شناخت، مزاحمت، ثقافت اس کی تہزیب اور قومی آزادی کا سوچ ختم کیا جاتا ہے۔ جو کہ ایک حیوانیت جیسے تعلیم ہوتی ہے۔ یا ہم مختصرا یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس تعلیم سے بچے کو لکھنے اور پڑھنے کا فن تو سکھایا جاتا ہے۔ لیکن اسے حقیقی علم سے روشناس نہیں کیا جاتا۔ اگر ہم کبھی اپنے گردو پیش پر غور کریں تو یہی ریاستی تعلیمی اداروں سے جو پیداوار ہمیں مل رہا ہے۔ وہ صرف اور صرف بلوچ کی سرزمین پر قائم ریاستی استحصالی اداروں کو مضبوط بنانے کیلئے ہی کارآمد معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ نہ کہ اس سرزمین کیلئے جو کہ وہ خود اس کا پیداوار ہے۔ اور اسی سرزمین سے اس کا مستقبل وابستہ ہے۔ موجودہ تعلیمی اداروں سے ریاست کو کلاس فور کے ملازم، فرمانبردار بیوروکریٹ چپڑاسی، کلرک، ریاستی تعلیم کو آگے پھیلانے کیلئے ٹیچرز، لیویز، پولیس، ایف سی، اے ٹی ایف، فوج کیلئے سپاھی، کئی کئی افسر ریاستی مقصد کو آگے بڑھانیکی تعلیم اور فرمانبردار غلام پیدا کرنے کیلئے کرایہ کے وفادار پیدا کرنا۔ یا ایک ایسا ڈاکٹر و انجینئر پیدا کرنا جو کہ صرف اپنیذات کیلئے ایک محدود زندگی بنانا چاہیں لوگوں کی خدمت کم کرپشن زیادہ اور اپنے لوگوں کا استحصال زیادہ کیا جاتا ہے۔ اور اس ذہنیت کے کچھ ڈاکٹر کو چھوڑ کر اکثر ڈاکٹر و انجینئر پنجابی ریاستی جبر کی وجہ سے اپنے غریب لوگوں سے ہاتھ ملانا ان سے بات کرنا ان کے مسائل سننا ان کے ساتھ تعاون کرنا دور کی بات ان کی طرف دیکھنا اپنے لیئے معیوب سمجھتے ہیں۔ اور اپنے شان کے خلاف۔ آپ نے دیکھا ھوگا کہ بلوچستان کے تمام پسماندہ علاقوں سے جو لڑکے ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد ایم بی بی ایس کی ڈگری لیتے ہیں تو ذہنیت یوں بن جاتا ہے۔ کہ وہ قوم کے پسماندہ علاقوں کے محدود کوٹہ پر ملازمت حاصل کرنے کے بعد شہری علاقوں میں رہائش اختیار کرتا ہے اور دیہی علاقوں میں اپنے لوگوں کا علاج کرنے سے گریز کرتا ہے۔ جب کہ بلوچستان میں لوگوں کی اکثریتی آبادی لگ بھگ 80% دیہاتوں میں اور 20% شہروں میں آباد ہیں۔

ایک اور ذہنیت ان طلبی تعلیمی اداروں سے، آپ لوگوں نے غور کیا ہوگا۔ کہ جوش جوانی کے ایام میں یہ اپنے حواس کھو بیھٹتے ہیں۔ اور نئی زندگی شادی خانہ آبادی کیلئے ان کا اولین سوچ یہ ھوتا ہے۔ کہ وہ کسی ڈاکٹر سے ہی شادی کرلے۔ جب ایسے تعلیمی اداروں سے لڑکوں کی یہ ذہنیت بن جائے۔ صنف نازک کا آپ خود ہی انصاف کیجیئے۔! زیادہ تر لڑکے اس مشکل خواہش میں ناکام نکلتے ہیں۔ بالآخر ناکام و نامرادی اور طیش میں آکر وہی سے کسی پنجابی نرس سے ہی اپنی نئی خانہ آبادی کے لیئے سمجھوتہ کرتے ہیں اور بزگ بلوچ کی اکثریتی آبادی کو اس کی صلاحیتوں سے کوئی فائدہ نہیں ھوتا۔ اب پنجابی ریاستی تعلیم کا حاصل یہ ہو۔ بلوچ کو نقصان زیادہ فایدہ کم۔ پنجابی کو فائدہ زیادہ اور نقصان کم دیتا ہو۔ اس پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہیئے۔ یہ سوال بھی کسی کے ذہن میں آتا ہو کہ ایسے ریاستی تعلیمی اداروں سے اچھے ڈاکٹر اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں اچھے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے میں میرا مدلل جواب یہی ہے۔ کہ آپ صحیح کہہ رہے ہو لیکن میں بھی غلط نہیں۔ وہ اس طرح کہ یقیناً ایسے اچھے لوگوں کی اخلاقی، سماجی، سیاسی، تعلیمی تربیت ہمارے غیر رسمی ادارہ بی۔ ایس۔ او نے کی ہو گی! بات جب غیر رسمی تعلیم کی ہو تو ہمارے پاس صرف بی ایس او ہی وہ سیاسی ادارہ ہے جو سیاسی تعلیم کے ساتھ ساتھ، بلوچ قوم کے حقیقی توانا قوت یعنی نوجوانوں کو ان کی قومی مفاد کے دفاع کی خاطر تعلیم، سیاست، ثقافت، بلوچ کی جغرافیہ، تاریخ، غلامی سے نجات اور قومی آزادی کی درس دی ہے۔۔ موجودہ بلوچ قومی آزادی کی تحریک کا اگر ہم باریک بینی سے جائزہ لیں تو کوئی بھی ایسا معاذ اور شعبہ نہیں جہاں بی ایس او کے کردار کو ہم نظر انداز کر سکیں اب بات جب بی ایس او کی ہو تو ہر سیاسی کارکن کے ذہنوں میں مختلف تنقیدی سوالات گردش کر رہے ہونگے اور یہی تنقیدی سوالات ہی ہماری سنجیدگی کے ثبوت ہوتے ہیں۔ اگر آج ہم بلوچ سرزمین کو لاحق خطرات اور چیلنجز پر نظر دوڑائیں تو یقیناً بی ایس او وقت کی ضروریات کو پورا نہیں کر رہا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ اس غیر رسمی تعلیمی ادارہ پر ریاست پاکستان نے مختلف طریقے سے حملہ کیا۔ کبھی برائے راست بلوچ نوجوانوں کو جبری طور پر گرفتار کر کے گمنام کیا یا شہید کیا گیا۔ یا انھیں معمولی ملازمت وغیرہ کے جھانسے میں پھنسایا گیا۔ اور بعض دفعہ بالواسطہ حملہ اس طریقے سے کیا کہ بلوچ سرزمین پر موجود بلوچ کی شکل میں پنجابی کے نمک حلال اور بلوچ کے نمک حرام اپنے پارلیمانی دلار مثلا بی این پی مینگل اور نیشنل پارٹی کے ذریعے مداخلت کروا کر اس کی طاقت کو تقسیم کیا گیا۔ مزید یہ کہ لیفٹ کی خیالی نظریہ اشتراکیت کو گمھا پھرا کر اسے کبھی حق خودارادیت، اور کبھی قومی تشکیل، طبقاتی مسئلہ، یا سب سے پہلے تعلیم، جیسے خرافات میں الجھایا گیا۔ اس کی وقت کو برباد کیا گیا۔ آج ہم اپنا جائزہ لے تو نقصان پوری قوم کا ہوا۔ اور

یہ سوال بھی کسی کے ذھن میں آتا ھو کہ ایسے ریاستی تعلیمی اداروں سے اچھے ڈاکٹر اور دوسرے شعبہ ھائے زندگی میں اچھے انسان بھی پیدا ھوئے ییں۔ ایسے میں میرا مدلل جواب یہی ھے۔ کہ آپ صحیح کھہ رھے ھو لیکن میں بھی غلط نہیں۔

یہ سب کچھ پنجابی آئی ایس آئی کے تعاون اور مرضی سے ایک منظم منصوبے کے تحت ھوتا رہا ہے۔ پنجابی بلوچ قوم کی اس ادارے کو انھی پارلیمانی دلاروں کے ذریعے سے نقصان دینے میں کامیاب ہوا۔ بی ایس او کی کمزوری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی سامنے آیا کہ اس کی باڈی اسٹرکچر باقاعدہ ہونے کے باوجود فرد پر زیادہ انحصار کرتا رہا ہے۔ بلوچ نوجوانوں کی اکثریت کے تقدیر کا فیصلہ اور انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا گیا۔ اور یہ ہمیشہ مرکزی چیئرمین سے ہوتا رہا۔ مرکزی لیڈر سنجیدہ تو تنظیم سنجیدہ اور اگر مرکزی عہدہ دار غیر سنجیدہ پوری قوم کے نوجوانوں کی ایک اچھی کیپ کا وقت اور مستقبل برباد۔! بی ایس او کی باقاعدہ باڈی ہونے کے باوجود تنظیم کے فیصلے سب کی مشاورت سے نہیں بلکہ ایک فرد اپنی طبیعت کے پالسیز بناتا ہے۔ اگر بلوچ آج بھی اپنی قومی نجات کے بارے میں سنجیدہ ہو کر سوچے ، بلوچ وطن اور عالمی سیاست کے معروضی حالات اور ضروریات کو دیکھے تو اسے اپنے ہی قومی قوت پر انحصار کرنا ہوگا۔ بات جب قومی قوت کی ہو تو سب سے اہم انسانی وسائل ہی ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ ثانوی فہرست میں آتے ہیں۔ ایسا کرنا اس صورت میں ممکن ہوگا جب ہم اپنی اس اہم غیر رسمی تعلیمی ادارے کو باقاعدہ منظم اور فعال کرینگے۔! ہم جیسے محکوم قوم کی آزادی و خوشحالی کیلئے ضروری ہے کہ اپنی تعلیمی حکمت عملی بنائیں۔ چونکہ قومی جنگ اور محکومی کے دوران ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کہ باقاعدہ رسمی تعلیمی ادارے بنائیں جہاں ہمارا اپنا تعلیمی نصاب ہو۔ یہ سب کچھ کم وسائل زیادہ مسائل میں ہمارے لئے مناسب متبادل کا راستہ یہ ہے۔ کہ ہم بی ایس او کو فعال اور منظم ادارہ بنائیں۔ کیونکہ آج تک بلوچ قومی آزادی کا جو کاروان اپنی منزل کی جانب گامزن ہے اس میں مزاحمتی جنگ کے ساتھ کلیدی کردار بی ایس او کا ہی مرہون اے منت رہا ہے۔ بی ایس او بلوچ نوجوانوں کو ریاستی تعلیمی نصاب کے جھوٹ، خرابیوں، خباثت، سے نکال کر قوم کے نو نہالوں کو اس سے چھپائی گئی اس کی تاریخ ، ثقافت، جغرافیہ، قومی ہیروز، قومی شاعر و ادیب، ان کی تخلیقات، اور دنیا کے اچھے رایٹرز، شاعر، ادیبوں، فلاسفرز کی علم اور سب سے اہم قومی آزادی کی جہد میں بلوچ مزاحمت سے بھی روشناس کرکے انھیں اپنے قوم کیلئے ایک نگہبان جیسے انسان کی تربیت کی ہے۔ موجودہ حالات میں بلوچ قوم کو پنیتیس طاقتور دشمنوں سے برائے راست دشمنی کا سامنا ہے۔

نمبر1 پاکستانPAKISTAN

نمبر2۔ چاہناCHINA

نمبر3۔ ایرانIRAN

اب حالات و خطرات اس طرح کے ہوں تو ہمیں وقت کی نزاکت کا احساس رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ہمیشہ سے پوری دنیا کی معاشی جنگ اور سیاست کا محور اپنے اپنے قوم کے مفادات کو محفوظ بنانے پر رہی ہے۔ ایک ہم ہی ہیں۔ جو اپنے قومی غلامی کے خلاف جنگ کو اب تک فیصلہ کن موڑ پر پہنچنےمیں کامیاب نہیں ہوسکے۔ حوصلہ افزاء4 بات یہ ہے۔ کہ آج بلوچ قوم کو نیک نیت، قابل، مخلص، اور عالمی سیاسی، سفارتی، داؤ پیچ کو سمجھنے کی اچھی طرح سے آگاہی رکھنے والا لیڈر شپ ملا ہے۔ جس کی بدولت موجودہ قومی تحریک کی جڑیں کافی گہرائی تک پہنچی ہیں۔ اب ہم اپنے موضوع بحث کی طرف دوبارہ آتے ہیں۔ جہاں کسی قوم کی قومی ریاست وجود رکھتا ہو۔ وہاں اس قوم کے نوجوانوں کو حقیقی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب کہ دشمن کی سامراجی تعلیمی نصاب صرف اس کی اپنی قبضہ گیریت کو قائم رکھنے کیلئے ہوتی ہے۔ ایسے تعلیمی اداروں میں ہمارے نونہالوں کو انسانوں کی طرح پڑھایا نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح سدھایا جاتا ہے۔ ٹیچر کو ایک محسن ہونا چاہئے جبکہ اس کا کردار ایک جلاد جیسا ہوتا ہے۔ سکول کو درس و تدریس کا ایک ادارہ ہونا چاہئے اس کے برعکس وہ ٹارچر سیل کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ حال ہی میں بلوچ قومی آزادی کی جنگ نے ہماری نئی نسل کو بھی متاثر کیا۔۔ جس کی تازہ مثال مستونگ کے پائلٹ اسکول میں بلوچ بچوں پر FCکا تشدد تھا۔ ایک ایسے تعلیمی نصاب جس کی ترتیب پنجابی کے نام نہاد دانشوروں نے کی ہو۔ وہ ہمارے لئے کیسے بہتر ہو سکتا ہے۔؟

اور نصاب وہ جس میں بلوچ کا کچھ خاص نہیں ادب، معاشرتی علوم، زبان، کلچر، تاریخ، جغرافیہ سب کی سب دشمن کی اپنی ہی ہوتی ہیں۔۔ ہمارے بچوں کو سب کچھ دشمن اپنی جھوٹی تاریخ وغیرہ پڑھاتا ہے۔ اور ہماری اپنی قومی ثقافت، تاریخ جغرافیہ، ادب، معاشرتی علوم وغیرہ کو سرے سے پڑھایا نہیں جاتا۔ اگر کچھ نام کی حد تک پڑھایا بھی جاتا ہے۔ وہ اصل تاریخ کو ردوبدل کرکے پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے بلوچ راہشون، شاعر، سیاستدان یوسف عزیز مگسی کے حقیقی کردار کو ردوبدل کرکے پنجابی نے اپنی ریاستی تعلیمی نصاب میں جھوٹے طریقے سے اسے مکمل ایک مسلم لیگی بنا کر پیش کیا ہے۔ وہی یوسف عزیز مگسی جو کہ عظیم تر بلوچستان کیلئے قوم کو سایسی شعور دیتا رہا۔ خود عملی جہد کا حصہ بنے۔ جیل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی۔ برطانوی سامراج کے خلاف قوم کو شعور دینے کیلئے مختلف اخبارات کا اجرا کیا۔ قومی غلامی کے خلاف آزادی کے حق میں اخبارات میں مضامین لکھے۔ جبکہ برطانوی سامراج نے اپنے اسلحے کی فراوانی کی زور اور ہماری داخلی کمزوریوں قبائلی مزاج کے تضادات، معاشی پسماندگی کی بناء4 پر ہمارے مادر وطن کو مختلف قوموں کے ساتھ بندر بانٹ کرکے قومی طاقت کو کئی اکائیوں میں تقسیم کرنے کی ایجنڈا میں کامیاب ہوا۔ یوسف عزیز مگسی کی کوششوں سے بلوچ نوجوانوں کیلئے ایک خفیہ تنظیم انجمن اتحاد بلوچ و بلوچستان کے نام سے 1920 میں قائم ہوئی۔ برطانوی ظلم و جبر اپنی انتہا کو پہنچا۔ اسی کے خلاف انھوں نے اخبار مساوات میں ایک کالم فریاد بلوچستان لکھا۔ جس میں وہ بلوچ قوم سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں۔ کہ آج ساری دنیا آزادی کی بدولت ترقی پر گامزن ہے۔ مگر ایک میری بلوچ قوم ایسے سوئی ہوئی ہے۔ کہ جاگنا نا ممکن سا لگتا ہے۔ قوم سے اپیل کی کہ خدارا اٹھیئے دوسرے قوموں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقعہ مت دیجئے۔ یہی وقت ہے۔ سیاسی غلامی کو جزبہ حریت سے غلامی کی زنجیروں کو تھوڑ ڈالئے۔ باہمی حسد و رقابت سے دور ہونا چاہیئے۔ اور آہن و آتش بن کر جنگ آزادی میں ہم سے زیادہ کوئی بہادر نہ نکلے۔ اور ہم سے پہلے کوئی جام شہادت نوش نہ کرے۔ بزدلانہ اور رجعت پسندانہ ذہنیت کو ختم کرنا چاہئے۔ اس کالم کے لکھنے کے بعد یوسف عزیز مگسی پر تخریب کاری اور بغاوت کا مقدمہ چلا۔ ایک سال قید دس ہزار نو سو جرمانہ کی سزا دی گئی۔ صرف ان کی ایک اخباری مضمون سے آج کے ہر بلوچ سیاسی کارکن اس دور کے سامراج کی بربریت کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے۔ ان کی قومی کوششوں سے بلوچستان کی تاریخ میں پہلی بار اولین سیاسی جماعت "انجمن اتحاد بلوچ و بلوچستان" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بلوچ راہشون نے بلوچی، فارسی میں انقلابی شاعری کی۔ اپنی شاعری میں آزاد وطن کی سماجی، معاشی انصاف اور غلامی کے خلاف آواز بلند کی۔ بلوچستان کے قومی پریس کی ابتدا اپنی ذاتی وسائل سے کی۔ اور چار کے قریب اخبارات کی اشاعت ممکن ہوئی۔

آپ نے قومی آزادی کے حق میں اور بلوچ وطن پر بیرونی قبضہ گیریت کے خلاف سندھ، سرحد، اور پنجاب کے بلوچوں کو اکھٹا کرکے قومی آزادی کی شعور دی۔ قوم کے ہر طبقہ فکر کو اس بات کا واضح انداز میں باور کرایا۔ کہ آزادی کی تحریک کے سامنے "سنڈیمنی اور جنرل جان جیکب" کی سرداری نظام ایک اہم رکاوٹ ہے۔ سرداروں کو اب کچلنا چاہئے۔ ان سے بہتری کی امید رکھنا اب فضول ہے۔ آخر کار ایک ایسا مقام آتا ہے۔ جہاں سنڈیمنی سردار اور سرکار یک زبان ہو کر سبی دربار میں خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اگر یوسف عزیز مگسی اور اس کے خطرناک جماعت کو چھوڑا گیا۔ تو یہ سرداری نظام اور برطانوی قبضہ گیریت کو ختم کرسکتے ہیں۔ نمیران یوسف عزیز مگسی برطانوی سامراج کو ان دھمکیوں کا جواب کچھ یوں دیتا ہے۔ ایسی غلامی اور جبر میں اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں۔ کہ آزاد بلوچستان کا قومی بیرک بلوچستان کے سرحدی علاقہ گرم سیل میں بلند کرکے اپنی تاریخی بلوچی روایات کے تحت بلوچی لشکرلے کر فرنگی سامراج پر بے رحمی سے حملہ کیا جائے۔ مزید یہ کہ قوم کے نوجوانوں کو تعلیم دینے کیلئے جھل مگسی میں جامعہ عزیزیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا۔ بلوچ رہنما نے وہاں بلوچستان کے جغرافیہ، تاریخ، ثقافت کے مضامین کو نصاب میں شامل کیا تھا۔ نواب یوسف عزیز مگسی نے تعلیم کے علاوہ سماجی برائیوں شراب بھنگ پر پابندی عائد کیا تھا۔ جلاوطنی کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ مختلف محاذوں پر جدوجہد کرینگے۔ اور مسلح مزاحمت کی جدوجہد

کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن زندگی نے وفانہ کی۔ اور بالآخر 30/31 مئی 1935 کی درمیانی شب کوئٹہ کے خطرناک زلزلے میں شہید ہوگئے۔ اس بلوچ دوست رہنما کی کردار اور اس کی سیاسی جدوجہد و بلوچستان کی آزادی کی فکر کو پنجابی قبضہ گیر ریاست پاکستان کی تعلیمی نصاب میں بدنیتی اور ایک منصوبے کے تحت یکسر بلوچ قوم کے نونہالوں سے چھپایا گیا ہے۔ اب ایک جائزہ لے پچھلے 68 سالوں سے ہمارے نوجوان نسل کو اپنے قبضہ گیر سلیبس سے اس کی اصل تاریخ، جغرافیہ، زبان، قومی رہنما، بلوچ وطن کے بے شمار معلوم نا معلوم شہدا اور اسیران کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تو آنے والے دنوں میں نئی نوجوان نسل کی ذہنی تربیت نہ کی تو سیدھا ریاست کے گود میں جاکر بیٹھے گا۔ ایک دانشور کا قول ہے۔ کہ اگر آپ اپنی قوم کے افراد کو فرداً فرداً آزادی کی فکر کو نہیں سمجائینگے۔ قومی غلامی کا شعور نہیں دینگے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ دشمن کے مورچے میں جاسکتا ہے۔ جس کو آپ نے قومی غلامی کا ذرا بھر شعور نہیں دیا ہو۔ اب قابض ریاستی تعلیمی نصاب سے کوئی محکوم قوم کیسے خیر کی توقع کرسکتی ہے۔ کہ وہ اس کی نئی نسل کو اس کے قومی ہیروز کی اصل کردار کو پڑھائے گی۔ ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہوگا۔ اب اس قومی ہیرو کی اصل زندگی اور قومی آزادی کی فکر سے بلوچ نوجوان نسل کو شناسائی دے۔ ہمارے غیر رسمی تعلیمی، سیاسی ادارہ بی ایس او نے اسے آزادی کی شعور دے دی ہے۔ نہ کہ قابض کی تعلیمی نصاب نے۔ یوں کوئٹہ میں 1935 کی ہولناک زلزلے سے بلوچ قوم اپنے ایک محسن سے محروم ہوگئے۔ اور ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ انھوں نے وطن کی آجوئی اور بلوچ راج دوستی کی خاطر ایک فرد کی حیثیت سے بہت کچھ کرگیا۔ لیکن زندگی نے وفانہ کی۔

اب یہ قومی ذمہ داری آج کے بلوچ نوجوان نسل کے کندھوں پہ آن پڑا ہے کہ وہ اپنے رہبر کی آزادی کی فکر کو کیسے قوم تک پہنچائیگی۔ دشمن کی حالیہ جبر و بربریت کو دیکھا جائے۔ تو بجائے ہم کوئی نیا تجربہ شروع کرے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس غیر فعال اور کمزور بی ایس او کو اپنی صلاحیتوں اور خلوص محنت کو شامل کرکے توانا درخت جیسا بنائے۔ اور بی ایس او میں شامل نوجوانوں کی اس طرح سیاسی تربیت کرے۔ جو کہ شخصیت پرستی سے پاک ہو۔ اور بی ایس او کو پارلیمانی دلار پارٹیوں کے پاکٹ آرگنائزیشن سے حتی الامکان بچائے رکھے۔ اپنے فرسودہ روایات کو چھوڑ کر نئی نسل کو جدید دنیا کے طرز زندگی اور سیاست سے ہم آہنگ کرکے اپنی نئی نوجوان نسل کو ہر گاوں، شہر کی سطح پر منظم کرکے غیر رسمی تعلیمی ادارہ میں انکی شرکت کو یقینی بنائے۔ بی ایس او میں نئے شامل ہونیوالے طلبہ کے ساتھ طالبات کو بھی ہر صورت میں شامل کیا جائے۔ مرکزی پالیسیز میں فرد کی جگہ پوری کابینہ کی رائے کو اہمیت دی جائے۔ سابقہ دور سے لے کر موجودہ دور تک بی ایس او کی کابینہ کو 2 سال کیلئے منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ اب اس کی اسٹکچر کو نئے سرے سے بنا کر منتخب کابینہ کو 2 سال کی بجائے 4 سال کیلئے اس کا انتخاب کیا جائے۔ کیونکہ سابقہ دور کی تجربات کو دیکھا جائے تو 1 سال تک اس کابینہ کی ارکان کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور انڈراسٹینڈنگ میں گزر جاتا ہے۔ جس وقت ان کی ایک دوسرے کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ پیدا ہوئی ہوگی۔ اس وقت اس کابینہ کی 2 سال کی مدت پوری ہوئی ہوگی۔ اسی طرح یہ تجربات کم نتیجہ کے ساتھ گزرتے جائینگے۔ کابینہ کی تشکیل کے بعد ان کو اپنی تنظیم۔ کاری پر توجہ دینا چاہیئے۔ سیاسی موبلائزیشن میں سب سے زیادہ لٹریچر پر کام کیا جائے۔ ایک اور اہم اصلاحی نقطہ نئی نوجوانوں کو سابقہ خیالی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں سیاست کرنے کی شعور دی جائے۔ جس کیلئے ایک اہم کام یہ کہ سابقہ تجربات سے سبق سیکھ کر اشترا کی تعلیمات اور لٹریچر سے دور رکھا جائے۔ اور نئی نوجوان نسل کو اس یہ سمجھانا چاہیئے کہ ہماری جہد انقلابی نہیں۔ بلکہ خالص قومی آزادی کی جہد ہے۔ اگر ہم اپنے نئی نوجوان نسل کو ایک ساتھ منظم کرکے قومی جہد برائے قومی آزادی کی سیاسی شعور دینے میں کامیاب ہوئے۔ تو زیادہ مشکل نہیں کہ ہم اپنے وطن سے دشمن کو نکال باہر پھینکیں۔ اور اپنے وطن کو ضرور آزاد کرینگے۔۔

بلوچ قومی تحریک :عسکری و سیا سی ڈسپلن کی کمی

شبیر بلوچ

بلوچ قومی تحریک باقی ماندہ تحریکوں کی طرح مختلف نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ سے گزر کر آج اس مرحلے اور مقام تک پہنچ چکا ہے۔ جس میں قومی تحریک نے عروج اور زوال کا سامنا کرتے ہوئے ہر آنے والے وقت میں باقی جہد کاروں کے لئے ایک نئی نصیحت اور سبق چھوڑا ہے۔ قومی جہد سے منسلک ماضی کے تجربوں سے سیکھنے والے جہد کاروں کو چاہیئے تھا کہ وہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر ایک ہی طریقہ کار کو دہرانے کے بجائے نئے سرے اور ایک نئی حکمت عملی سے قومی جدوجہد کے عمل کو جاری رکھتے، اسٹراٹیجک حوالے سے اور آزادی کے سنگل ایجنڈے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے نصب العین کو واضح کرنے کی حد تک تو یہ تحریک ماضی کی تلخ تجربوں سے خاصی حد تک نہ صرف مختلف رہی ہے بلکہ اس میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس دفعہ کی اٹھان پکڑتی بلوچ قومی تحریک میں کوئی شئے ایسی نہیں تھی جسے وقتی رد عمل کے جذبے سے تعبیر کیا جاتا، بلکہ اس اچانک، برجستہ اور فطری تحریکی ابھار نے دشمن کو بھی حیران کر دیا تھا کیوں کہ ایسا ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ بلوچ قوم ایک بار پھر اس طمطراق کے ساتھ ابھر کر سامنے آئیگی بلکہ انکا یہی ماننا تھا کہ اب آزادی کے متوالے قصہ پارینہ بن چکے ہیں اور بلوچستان پاکستان کا ایک اٹوٹ جز بن چکا ہے، جہاں جذباتی پن، رد عمل اور وقتی و معمولی مفادات کی خاطر ابھرتے تحریکوں نے اپنی سانسیں بڑی ہی مختصر مدت میں چھوڑ کر خاموش ہو گئی ہوں وہاں کسی منظم اور دیرپا جدوجہد کی کوئی امید موجود تو نہ تھی۔

ماضی میں خان آف قلات کی گرفتاری و نیپ کی نام نہاد صوبائی حکومت کی برطرفی سے بن جانے والی نیم قومی جہد کی فضا سے آج کی جدوجہد نہ صرف بنیادی ساخت و ہئیت کے حساب سے مختلف رہی ہے بلکہ ماضی کی کسی انداز جدوجہد سے بھی میل نہیں کھاتی ہے اور نہ ہی انکی طرح کسی ختم ہوئی جدوجہد کی عین مزاج و نوعیت کا تسلسل رہا ہے چونکہ ماضی کی تمام شروع اور اختتام پذیر ہونے والی تحریکی عمل ایک دوسرے کے عین تسلسل تھے لہذا زمینی حقائق اور اس جدوجہد کی دورانیہ اور مزاحمانہ قوت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالیہ جدوجہد کم از کم ایسی بنیادوں پر استوار ہے جو کہ ماضی کے کسی بھی جدوجہد میں ہمیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ اگر دیکھا جائے تو بلوچ قومی تحریک میں 1948 سے لیکر 1974 تک کی تمام جدوجہد ایک ہی طریقہ کار اور حکمت عملی کے تحت کئے جارہے تھے لیکن 2000 میں قومی جدوجہد کا رخ اور سمت سمیت طریقہ کار اور حکمت عملی میں بھی فرق دیکھنے کو ملا اس میں ایک سوچ ایک فرد سے شروع ہوا اور اسکی ذہانت ایمانداری ،خلوص، کمنٹمنٹ اور نیک نیتی کے ساتھ ساتھ طریقہ کار اور حکمت عملی میں تبدیلی نے جدوجہد کا ترتیب اور ظاہری ڈیل ڈول بھی تبدیل کیا۔ جس طرح فریڈرک اعظم نے پروشیا کو اپنی صلاحیت ، قابلیت ،مہارت سے ترقی کی بام نہم تک پہنچایا بلکل اسی طرح سنگت حیربیار مری نے بلوچ قومی تحریک کو ایک نئی شکل اور روپ دیکر اسے ایک نئی اپروچ اور حکمت عملی سے آشنا کروایا، ہم یہ دعوی کیوں کرتے ہیں کہ سنگت حیربیار مری نے اس تحریک کو ماضی کی روایتی جذباتی پن اور رد عملی کیفیت سے نکال کر اسکو ایک منظم اور قومی سوچ کے مظہر کے عکاس جیسا ایک جدوجہد بنا دیا؟، جب سنگت حیربیار مری اپنے دوستوں کی مشاورت سے تحریکی کاموں کو سہل بنانے کے واسطے پاکستان کے نام نہاد پارلیمنٹ کے ممبر بنے تو یہ بات بھی آج روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس نے کس طرح اپنے شب و روش کی محنت و مشقت اور جان فشانی سے دوستوں کے ساتھ مل کر تحریکی لوازمات کی حصول کی جدوجہد کی، اور اسکے بعد جب تحریک کو چلانے اور باضابطہ آغاز کرنے کا موقع آیا تو اس میں بھی سنگت حیربیار مری نے بخل سے کام نہیں لیا بلکہ جدید عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے قومی تحریک کو ایک فردی، قبائلی اور گروہی چھاپ سے بچاتے ہوئے قومی تحریک کے تمام فیصلوں اور اختیارات کو اپنے ہاتھوں تک محدود رکھنے کے بجائے اپنے ساتھیوں پر یقین رکھتے ہوئے انہیں ہر طرح کی امداد بہم پہنچائی اور انہیں بھرپور موقع دیا کہ وہ اپنے حلقہ اثر میں اپنے اجتماعی قومی قوت کو بروئے کار لاکر قومی تحریک کو ایندھن فراہم کریں اور قومی آزادی کی اس جدوجہد میں ہر ایک اول دستے کا کردار ادا کرے۔ انکو قومی جذبے کی اور قومی جدوجہد کی اصولوں کے مطابق طاقت کے سرچشمے میں سے برابر حصہ دیا گیا، عسکری حوالے سے طاقت کی ارتکا ز شاید لازم تھی۔ جدید دور میں زیادہ تر کہا جاتا ہے کہ کسی بھی جدوجہد کو جیتنے اور کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے تنظیم، ولولہ انگیز لیڈر، ڈسپلین، اصول اور برتر حکمت عملی کا ہونا ضروری ہے، تحریک اگر جسم کے تمام عضو اور اَرگن کا نام ہے تو تنظیم اسکے دل اور گردے لیڈر اسکا سر، حکمت عملی دماغ اور ڈسپلین اور اصول اسکے بازُو ہیں اگر انسانی جسم کی طرح ان تحریکی اَرگن میں ایک بھی صحیح کام نہ کرے تو تحریکی عمل سست روئی اور بیماری کا شکار ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے آج صرف ایک جسمانی آرگن کی بلوچ تحریک میں بھرمار ہے وہ ہے تنظیم اور پارٹیاں، وہ پارٹیاں بھی ہر کسی کی اپنی حرص و ہوس اور گروہی اور خاندانی فلاح و بہبود سے بنے ڈیڑھ انچ کی مسجدیں ہیں۔ یہاں باقی لوازمات نہ ہونے کی وجہ سے تحریکی باڈی جسم بغیر حافظہ اور بازُو کی طرح intensive care unit (ICU), میں ہے۔

کیونکہ ڈسپلن اور فنِ حرب اور عمل درآمد کے علم کی قلت اور کمی نے تمام آزادی پسند پارٹیوں کو جسم بغیر دماغ اور بازُو کی مانند کر دیا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اس تحریک کی بنیادیں تو ماضی سے ضرور مختلف انداز میں رکھی جاچکی ہیں جو کہ ناقابل تسخیر ہیں لیکن ہم بحیثیت قوم اپنی ،ذاتی پسند و ناپسند اور گروہی اور خاندانی مفادات تک محدُودیت سمیت روایتی و قبائلی دائروں سے ابھی تک آزاد نہیں ہوئے، ایک نئی بنیاد کے ساتھ پرانی سوچ کو لے کر چلنے سے آج وہ فرسودہ انداز فکر و عمل ہمارے سامنے ہے اور ہمارے پیروں کی زنجیر بن چکی ہے، ایک قابض کی حیثیت سے پاکستان نے اس طویل المدتی دورانیے کی جدوجہد کو کاؤنٹر کرنے کے لئے طرح طرح کے حیلے اور حربے آزمائے، ہماری پوری تحریکی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ جب لوگ گرفتار کیئے جاتے تھے تشدد کر کے چھوڑ دیئے جاتے تھے، جب مقامی لوگوں کو لالچ و پیسے دیکر ان سے معلومات اکھٹی کی جاتی تھی، جب مقامی لوگوں کو گروہوں جتھوں کی شکل میں مسلح کر کے تحریک کے سامنے کھڑا کیا جاتا، جب مقامی گماشتوں کے ذریعے ووٹ و نوٹ کی بازار گرم کی گئی، اور پھر گمشدہ لوگوں کی مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی کا سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری و ساری ہے، اسکے ساتھ ساتھ مقامی مذہبی بنیاد پرستوں کو معاشرے میں پھیلا کر بلوچ تحریکی دوستوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا میں مذہب اور آزادی کی جنگ کی بازگشت کو آپس میں ملانے کی سازشیں ہوئیں، پھر سرنڈر اور ہتھیار پھینکنے جیسے عمل بھی ہو رہے ہیں، یہ سارے اور بہت دیگر ایسے عمل اور عوامل ایک دم وقوع پذیر ہر گز نہیں ہوئے بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ دشمن کی طرف سے پالیسیوں میں زمینی حقائق و ضروریات کے مطابق تبدیلیاں پیدا کی گئیں لیکن ہم نے کیا کیا، سیاسی و عسکری لحاظ سے ہم بیشتر معاملات میں وہیں کہ وہیں رہ گئے جبکہ ایک چھوٹے پیمانے کی طاقت حاصل کر کے ہم اپنے لوگوں کے خلاف صف آراء ہو گئے جو کہ تحریک آزادی کی

بدنصیبیوں میں سے سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ جیاپ ویتنامی فوج کے معمار ہونے کے ساتھ فوجی رسد اور نقل و حمل کی انتظام، آزادی کی جنگ لڑنے اور خاصی حد تک نئے چیزوں کو قبول کرنے اور لچک کا مظاہرہ کرنے کے معاملے میں ایک بہترین استاد تھا، اس وقت اور اس سے پہلے بہت کم لوگ اس حد تک پہنچ چکے تھے وہ اپنے بہترین حکمت ودانائی کی وجہ سے "سرخ نپولین" پکارا جانے لگا تھا، اسی کی کامیاب حکمت نے فرانس پر 1945 کے ڈن بن پو کے جنگ میں ایسی کاری ضرب لگائی کہ بالآخر اسے انڈوچائنا سے اپنا بوریا بستر گول کر کے نکل جانا پڑا"

یہی جیاپ تھا جس نے اپنے کامیاب و بروقت حکمت عملی کے ذریعے فرانس کے بعد سپر پاور امریکہ کو بھی ناکوں چنے چبوا کر شکست فاش سے دوچار کیا، جیاپ نے کہا کہ حیران کردینے والی اور نت نئے انداز کے ساتھ جنگی طاقت ہی کامیابی کا ضامن ہے اور ضرورت سے زیادہ بااعتمادی اور شیخیاں بگھارنے سے شکست ہی مقدر ہوگی۔ جبکہ اسکے برعکس ہماری قومی تحریک میں حکمت عملی کا بہت زیادہ فقدان نظر آتا ہے کیونکہ دھراؤ کی پالیسی زیادہ تر پارٹیوں اور تنظیموں نے اپنائی ہوئی ہے ' آ بیل مجھے مار" جیسے دھراؤ والی پالیسی کم از کم ہمارے سیاسی و شعوری سوچ کے دعویداروں پر بالکل صادق آتی ہے، بی ایس او 1967 میں معرض وجود میں آیا، تب سے لے کر اب تک وہی جذباتی نعرے اور وہی گلی محلوں کی سیاست، اب کی بار تو اتنے لوگ شہید ہوئے اتنے پابند سلاسل ہوئے، کثیر تعداد میں لوگوں کو غائب کیا گیا اور اب حالیہ دور میں سرنڈر جیسے ناسور کے باوجود ہم اپنی غلطیوں کو تسلیم کر کے خود کو سنوارنے کے بجائے اپنے گردنوں میں سریاڈال کر ایسے اکڑا کڑ کر چلتے ہیں جیسے ہم نے کوئی سنگ میل سر کرلی ہو، مگر چند انفرادی نامور شخصیات کے سایہ جبر کو ہٹا کر تو دیکھ اسکے نیچے کیا ہے سوائے افسوس اور ناکامرانیوں کے، مگر ہم ہیں کہ باز نہیں آتے۔ شہدا اور جبری گمشدہ لوگوں نے جو قربانیاں اور اذیت برداشت کر کے لوگوں کو اپنی جان کی قربانی دیکر غلامی کی گہری نیند کی کیفیت سے بیدار کیا جگانے والے بلوچ شہدا نے نیک مقصد کی خاطر اپنا کام کر کے لوگوں کو تحریک کے حق میں کردیا لیکن پھر اسی تحریک میں ڈسپلن اور فنِ حرب کی جمود اور بے یقینی کی کیفیت اور علم کی عدم موجودگی نے غلامی کے خلاف بیدار لوگوں کو قومی جہد سے مایوس کروا کر انھیں پروپوفول کی دوا دیکر پھر سے انھیں غلامی کی گہری نیند میں سلادیا، اگر کل کسی بھی حوالے سے (جذباتی یا شعوری) لوگوں کی بڑی تعداد آپکے ساتھ تھی تو آج کیوں وہ اس راہ کے مسافر بن جانے کے روادار نہیں، چلو مان لیتے ہیں کہ جذبات کی زندگی مختصر ہوتی ہے مگر انہی جذبات کو شعور کے سانچے میں ڈالنے کا عمل خود ایک مکمل نصب العین اور برابر اسٹرا ٹیجی کا متقاضی تھا، جذبات کو ایک کامیاب حکمت عملی کے تحت ہمیشہ کے لئے ایک نا قابل تسخیر شعوری کیفیت میں بدلنے کے بجائے ہم نے کیا کیا؟ انہی جذبات پر قانع رہے اور شکر ادا کرتے ہوئے لوگوں کی جم غفیر دیکھ کر مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنے ہی خوابوں کے خلاف ہلا کو وچنگیز بن کر ابھرے، جیسے کہ ہماری طاقت انہی کو فتح کرنا تھا، سیاسی لحاظ سے اگر نظر دوڑائیں تو تنظیموں و پارٹیوں میں اس طرح کی بھڑک بازی اور متکبرانہ پن برقرار رہا کہ جس نے اختلاف کیا وہ قابل گردن زدنی ٹھہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ تنظیمیں اور پارٹیاں ایک قومی خدمت کی ذرائع ہونے کی بجائے ان لوگوں کی ذاتی جاگیر کا حصہ ہیں، اب اس کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم کس طرح اپنی صفوں میں اس بدنظمی و ناعاقبت اندیشی پر قابو پاسکتے ہیں، اگر دیکھا جائے تو اس مرض کا علاج موجود ہے اگر نیت صاف ہو اور مطمع نظر قومی تحریک کا وسیع تر تناظر ہو۔ انھیں علامت سے قومی تحریک میں مرض کی تشخیص کرتے ہوئے

سنگت حیربیار مری نے قومی مایوسی کو ختم کرنے اور تحریکی مرض کے علاج کے لئے اتحاد اور یکجہتی کا نسخہ اور دوا دیا جس سے ڈسپلن اور فنِ حرب اور عمل درآمد کے علم کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے، اسی نسخے سے اس بدنظمی و بے ہنگم بحرانی کیفیت کی تدارک ممکن ہے اور قومی تحریک پھر سے منظم اور مضبوط ہو کر خطے کے بدلتے ہوئے حالات میں بلوچ قومی محکومی کو قومی حاکمیت اور آجوئی میں بدل سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اتحادی عمل جو تدارک، تدبیر اور شفایاب تحریک سے مشروط ہے جس کو شعرا بن ذی الجوشن جیسے چند مسمار کندہ اور بگاڑو لوگ سبوتاژ کرنے کے لئے بھی سرگرم ہو چکے ہیں اور یہ لوگ قومی تحریک میں موجود مسئلہ مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے بجائے انھیں مزید مشکل بنانے کی کوشش کررہے ہیں کیونکہ ان بگاڑو لوگوں کی پہلی ترجیح اور فوقیت قومی تحریک کے نام پر انکے ذاتی، خاندانی، اور گروہی مفادات ہیں اور انکے لئے قومی تحریک ایک جزوقتی کام اور تفریح کی مانند ہے اور یہ لوگ قومی تحریک میں مرض کی تشخیص اور علاج کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوششوں میں بھی مصروف عمل ہیں اور اگر تیز نگاہ اور تیز فہم جہدکاروں نے تیز فہمی اور تیز نگاہی سے ان مسمار کندہ، بگاڑو اور سازشی لوگوں کی سازش طشت از بام نہ کیا تو زیادہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ لوگ بلوچ قومی تحریک کو بھی ارتریا طرز نہ الجھائیں۔ جبکہ ارتریا کے برعکس بلوچ قومی تحریک میں پانچ سے دس سال نازک اور فیصلہ کن ہیں اگر یہ سہمے بلوچ قوم نے چند بگاڑو لوگوں کی وجہ سے ضائع کئے تو یہ قومی ٹریجڈی اور المیہ سے کم نہیں ہوگا ہمیں اس صورتحال میں قومی تحریک میں موجود مسئلے مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لئے مشرقی تیمور کی ماڈل اپنانا چاہئے جہاں پر اتحادی عمل تدارک، تدبیر اور شفایابِ قومی تحریک سے مشروط تھا، کیونکہ جنگ اور جدوجہد مکمل طور پر تبدیلی کا نام ہیں، ہم ایک سفاک دشمن سے صف آراء ہیں، ہمیں چاہیے کہ دشمن کی گرفت کو کمزور بنانے کے لیے اسی کے رویوں اور اندازوں کے مطابق اپنی جد و جہد میں تبدیلی لائیں، دشمن کی ہر چال جہدکاروں کے لئے نئی چیلنج کی مانند ہے اور ماضی کی غلطیوں کو دہرانا ،انفرادی، تنظیمی اور اسکے ساتھ ساتھ قومی حماقت کے زمرے میں آتا ہے اور بنیادی نصب العین اور حکمت عملی کو

جیاپ نے کہا کہ حیران کردینے والی اور نت نئے انداز کے ساتھ جنگی طاقت ہی کامیابی کا ضامن ہے اور ضرورت سے زیادہ با اعتمادی اور شیخیاں بگھارنے سے شکست ہی مقدر ہوگی۔ جبکہ اسکے برعکس ہماری قومی تحریک میں حکمت عملی کا بہت زیادہ فقدان نظر آتا ہے کیونکہ دھراؤ کی پالیسی زیادہ تر پارٹیوں اور تنظیموں نے اپنائی ہوئی

چھوڑ کر باقی موقع و مناسبت کے حساب سے آپریشنل اور ٹکٹیکل حکمت عملی کو بار بار تبدیل کرنا کامیابی کی نشانی ہے ویت نامی جنگ میں جنرل وو گوین جیاپ کا ایک اصول تھا کہ وہ بڑی بڑی جنگی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود خود کو ناکام تصور کرتے ہوئے دوسرے نئے معرکے میں پہلی والی حکمت عملی کو نہیں دہراتا تھا وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کامیابی سے نشہ نہیں ہوتا تھا جیاپ کے پاس ایک سادہ سا اصول تھا کہ ہر کامیاب کاروائی کے بعد وہ سوچتے تھے کہ یہ اصل میں ایک شکست تھا (اس وجہ سے کہ وہ اس سے بہتر کرنا چاہتے تھے) اور وہ نتائج پر کبھی ناز و فخر نہیں کرتے تھے بلکہ ہر نئے معرکے میں ایک انوکھی حکمت عملی کے ساتھ اترتے اور خیال کرتے کہ ہر وار ایک نئی حکمت عملی کا متقاضی ہے

جسکا مقصد ہے کہ جدوجہد خاص کر جنگ میں دماغ کو رقت انگیز اور موثر رکھنا ضروری ہے، the 33strategies of war کتاب میں لکھا ہے کہ جب ہم بچے تھے تو ہمارا دماغ کبھی بھی نہیں رکا ہم نئے تجربات کے لئے کھلے ہوئے تھے ہم زیادہ سے زیادہ چیزیں جذب کر سکتے تھے، اس میں لکھا ہے کہ سارے عظیم فوجی حکمت عملی کے ماہر، مثلاً سکندر اعظم، نپولین اور موساشی اس حوالے سے بالکل بچوں جیسے ہی تھے اور کبھی کبھار تو وہ بچوں کی طرح عمل بھی کرتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلی حکمت کار چیزوں کو انکی اصلی حالت میں دیکھتے ہیں، وہ

ممکنہ خطرات و مواقعوں کے حوالے سے خاصے حساس ہیں، عظیم حکمت عملی کے ماہر لوگ اپنے ادراک کی بنیاد پر نہیں بلکہ وہ تحریک اور نقل حرکت کے پیش نظر عمل کرتے ہیں۔ جیاپ سمیت تمام کامیاب جنرل اور جہد کار ماضی کی اپنی کامیابیاں نہیں دہراتے تھے اس لئے وہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے، ان کے لئے جو کام گزر گیا اسکی مقصد کے حصول کے اعتبار سے حیثیت اس لئے ختم ہو گئی کہ یہاں سے منزل تک پہنچنے کے لئے ماضی کی عوامل کا کوئی خاص کام نہیں بلکہ اب سے جو کچھ کیا جائے گا وہی چیز آپکو منزل تک پہنچا سکتی ہے، یہی جیاپ جیسے لوگوں کا ہر کامیاب کاروائی کے بعد خیال رہتا تھا، انکی نظریں چونکہ اپنی کامیابیوں سے زیادہ مجموعی مقصد کی کامیابی پر ٹھکی رہتی تھیں، دوسری طرف بد قسمتی سے کم علمی یا ذہنی کم مائیگی کی وجہ سے بہت سارے لوگ چھوٹے چھوٹے کام کر کے اتنا مدہوش اور نشے میں دھت ہو کر قوم، تحریک، مجموعی مقصدیت، منزل اور اپنے لوگوں سمیت خود کو بھی بھول جاتے ہیں اور ہم بلوچ ساتھ ہی ساتھ دس سال سے متواتر اور تواتر کے ساتھ اپنی غلطیوں کو دہرا رہے ہیں اس لئے تو آج قومی تحریک ان چند لوگوں کی ان ہی غلطیوں کی وجہ سے جسم بغیر دماغ اور بازو کے مانند ہو چکا ہے اگر ہمیں قومی جدوجہد کو کامیاب کروانا ہے اور قومی جہد کو کاروبار اور خاندانی اور گروئی فلاح و بہبود کے بجائے قومی آزادی اور قومی فلاح اور بہبود کی طرف راغب کرنا ہے تو ہمیں اپنی ماضی کی تمام غلطیوں سے اجتناب کرتے ہوئے قومی تحریک کو آزادی کی منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے جدوجہدی تمام تقاضے پورے کرنے ہونگے

ھمگام انٹرویو

جواد میلا

ڈاکڑ جوادمیلا ۱۹٤٦ میں دمشق میں پیدا ہوئے ، انکے والد ابراھیم میلا کرد جھدکار تھے۔ ان کے والد نے جالادت بادرخان کے ساتھ مل کر آزاد کرد ریاست کو تشکیل دینے کی دوبار کوشش کی ، پھلے اگری کے پھاڑی علاقوں میں اور دوسری بار مغربی کردستان میں ، لیکن دونوں دفعہ کرد ریاست زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ڈاکڑ جوادمیلا آج کل لندن میں مقیم ھیں۔

ھمگام: کیاجدید دور میں کردوں کا کبھی اپنا ایک الگ ریاست رہا ہے؟

جواب: گزشتہ صدی میں ۱۹۱۹ سے لیکر ۱۹۲۴ تک ہمارا کردستان ایک مملکت رہا ہے۔ موجودہ عراق کے زیر تسلط علاقے جنوبی کردستان پر شیخ محمود حافظ حکمران تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ کی فوجیں عراق اور کردستان میں پہنچ گئیں اور انہوں نے کردستان میں تیل دریافت کیا۔ اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ کردستان کا مسئلہ سیاسی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ کردستان کی وسائل اور تیل کا ہے۔ کردستان کے بادشاہ نے برطانیہ کی فوجوں کو کردستان میں داخل ہونے سے روک لیا تھا۔ بہت بڑی لڑائی ہوئی، اس میں برطانیہ نے اپنی ائیر فورس کو استعمال کیا جس سے کردوں کو شکست ہوئی۔ ہمارے بادشاہ کو زخمی حالت میں گرفتار کیا گیا اور بعد میں اسے ملک بدر کرکے دو سال تک ہندوستان میں پابند سلال کیا گیا۔ اس وقت عراق میں کوئی بادشاہت نہیں تھی۔ انگریزوں نے سعودیہ سے شہزادہ فیصل کو استعار لے کر عراق اور کردستان کا بادشاہ بنادیا۔ ۱۹۴٦ میں ہمارا ایک اور مشرقی ریاست کردش ریپبلک مہاباد کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جو موجودہ دور میں ایران کے زیر تسلط ہے۔ یہ ریاست تقریباً گیارہ مہینے تک اپنا وجود برقرار رکھ سکا۔ اس وقت برطانیوی، امریکی اور ایرانی فوجی مل کر ہمارے ریاست پر حملہ آور ہوئیں اور روس نے شروع میں مہاباد آزاد کردستان ریاست کی حمایت کی لیکن بعد میں اس نے مہاباد ریاست کو ان قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ۱۹۳۰ سے ۱۹۲۷ کے دوران ارارات کے پہاڑوں میں کردوں کی ایک حکومت بنی تھی۔ اب حالیہ دور میں عراقی کردستان میں ہماری ایک حکومت ہے لیکن وہ کردستان ریپبلک اور کردستان مملکت کی طرح آزاد نہیں ہے۔

ھمگام: بہت سے لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ بلوچ اور کرد ایک ہی نسل کے لوگ ہیں، اور کچھ لوگوں کا بشمول کچھ بلوچوں کا یہی خیال ہے کہ بلوچ اصل میں عرب ہیں۔ تو اس حوالے کردوں کی تاریخ میں بلوچوں کا کیا ذکر ہے؟

جواب: میرے خیال میں قبضہ گیر قوتوں عراق، سوریا، ایران، ترکی اور پاکستان نے کبھی بلوچوں اور کردوں کیلئے تاریخ کو چھوڑا نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہماری تاریخ کو مسخ اور چھپانے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم اپنی تہذیب اور تاریخ جان سکیں۔ ہماری تہذیب بہت قدیم اور پرانی ہے۔ میرے خیال میں، تین ہزار سال قبل کردوں کا اپنا ایک امپائیر تھا جسے میدی یا ماد سلطنت بھی کہا جاتا ہے (نوٹ: ماد کی قدیم زبان کی صرف تین شاخین آج زندہ ہیں، جو کہ بلوچی، گلکی اور، کردی ہیں)۔ میرا یہی خیال ہے کہ بلوچ، سندھی اور پشتون میدس شہنشاہیت کے جنوبی محاذ کے حصہ رہے ہیں اور شمالی افریقہ میں امازغ مغربی محاذ کے حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی شہنشاہیت تھی آج مشرق وسطی کے تمام ریاستیں ہم سے دشمنی کررہے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ہم کمزور ہیں، بلکہ وہ اس لیے کہ ہمارے پاس ایک مضبوط تہذیب اور قومی وقار ہے۔ اس سے ان تمام ریاستوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم ایک آزاد ریاست بن گئے تو ہم ان پر پھر سے مسلط نہ ہوجائیں! لیکن وہ غلط ہیں۔ ہم نے کسی کو قوت سے قبضہ نہیں کیا بلکہ ہماری تہذیب اور انسانیت لوگوں کو فاتح کیا ۔

میں آپ کو کردش شہنشاہیت یا ماد امپائر کے بابت ایک بات بتادوں کہ اس وقت جب بھی کوئی بات یا اعلانیہ شائع ہوا کرتا تھا تو وہ اسے سات زبانوں چھاپتے تھے۔ تین ہزار سال پہلے ہم ان تمام قوموں کو انکے زبان کے ساتھ تسلیم کرتے تھے۔ اب یہ بد تہذیب وحشی ریاستیں بلوچستان اور مشرق وسطی میں کردستان پر مسلط ہوچکے ہیں اور ہمیں اپنی زبان تک میں بات کرنے نہیں دیتے۔ صلاح الدین ایوبی جس نے مشرق وسطہ پر حکمرانی کی تھی وہ ایک کرد تھا۔ لیکن ہمارے حکمرانوں نے کسی کو جرأیہ نہیں کہا اپنا زبان چھوڑدو اور کرد بن جاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہماری تہذیب سے ڈرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ 1972 میں جب میں کردستان کے انقلابی لیڈر جنرل بارزانی سے ملا تو صدام حسین نے اپنے لوگوں کو جنرل برزانی کو قتل کرنے کیلئے بھیجا تھا جس میں وہ ناکام رہے، تو اس وقت دوسرے آزادی پسند کردش پیشمرگہ (سرمچاروں) نے بارزانی سے کہا کہ وہ اس کا بدلہ صدام سے لینگے تو جنرل نے کہا کہ نہیں، کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو مجھ میں اور صدام میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ یہ اس بات کا دلیل ہے ہم میں تہذیب اور انسانیت ہے۔ ترکوں، عراقیوں اور ایرانیوں نے کئی دفعہ ہمارے قصبوں اور گاؤں پر حملہ کیا، ہمارے بچوں کا بے دردی سے قتل کیا، لیکن کیا ہم نے کبھی ان کے شہروں میں جاکے کسی بے گناہ کو مارا؟ نہیں!

ہمگام : پی کے کے کا دوسرے کرد علاقوں میں کیا کردار ہے؟

جواب: پی کے کے مختلف ناموں سے کردستان کے ہر علاقے میں موجود ہے جیسا کہ سوریا میں پی وائی ڈی اور عراق اور ایران میں دوسرے مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں اور دوسرے سیاسی پارٹیوں سے مختلف طریقے سے جہد وجہد میں مصروف ہیں۔ تین سال پہلے میں نے قندیل کے پہاڑوں میں ان کے لیڈر شپ سے ملاقات کی تھی۔ میں لندن سے عراقی کردستان گیا اور وہاں سے میں مغربی کردستان گیا جو کہ سوریا کے زیر تسلط ہے۔ کیا آپ جانتے ہو کہ سوریا کی رجیم نے مجھے گزشتہ تیس سال سے ایک مطلوب شخص قرار دیا ہے؟ لیکن میں سوریا کے زیر تسلط کردستان کے علاقے گیا جہاں عرب نہیں تھے، ان کو میں نے بہت سی تجاویز اور آیڈیاز دیں۔ وہ میری بہت عزت کرتے ہیں اور انہوں نے میری حفاظت کے لئے دو پیشمرگہ اور سفر کے لیے ایک گاڑی فراہم کی۔

ہمگام: میرا یہ سوال کردوں کی قومی صلاحیت کے متعلق ہے جیسے ہی سوریا بکھر گیا اور خانہ جنگی شروع ہوئی تو کردوں نے فوراحرکت کرتے ہوئے اپنے علاقوں کو کنڑول کرنا شروع کردیا، اتنی جلدی میں انہوں نے یہ کام کیسے انجام دیا؟

جواب: اس آشوب سے پہلے جو کہ 2011 شروع ہوئی، امریکہ اور یورپین یونین نے 2004 میں کہا تھا کہ سوریا، ایران اور شمالی کوریا بدی کے محور ہیں۔ جب انہوں نے یہ کہا تو کردستان میں ایک بڑی بغاوت ہوئی۔ ہم نے بشار الاسد کا مجسمہ گرادیا جو کہ صدام حسین کے مجسمے سے بھی بڑا تھا۔ صدام کا مجسمہ تو امریکی ٹینکوں نے گرایا تھا لیکن کردستان میں بشار کا مجسمہ امریکیوں کے بغیر ہمارے لوگوں نے گرایا تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ کردوں کا uprising عربوں کے 2011 کے انقلاب سے بہت پرانا ہے۔ بشار کی مجسمے کو گرانے سے سات سال قبل ہم نے سوریا کے پرچم کو جلایا اور اس کی جگہ آزاد کردستان کا پرچم لہرایا۔ بلوچ اور کرد اور دوسرے ستم رسیدہ اقوام آزادی کے لیے تڑپتے ہیں۔ اسی لیے تو جب بھی ان کو ایک چھوٹا سا موقع ملتا ہے تو وہ اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب سائنسدان بھیڑیوں پر تحقیق کر رہے تھے تو انہوں نے ان کے ایک بچے کو ان سے الگ کیا اور دوسرے بھیڑیوں سے الگ کر کے اسے پالتو جانوروں کی طرح پال رکھا، بھیڑے کا وہ بچہ کتوں اور بلیوں کا طرح عمل کرنے لگا لیکن جب اسے واپس پہاڑوں پر لے گئے اور جب اس نے دوسرے بھیڑیوں کو دیکھا اور سنا تو چند منٹ بعد اسکی فطرت بدل گئی اور وہ پالتوں کتوں اور بلیوں کے بجائے بھیڑیوں کی طرح عمل کرنے لگا۔ بلکل اسی طرح آزاد منش قوم کی حیثیت سے جب بھی بلوچ اور کرد کو موقع ملتا ہے تو وہ بھیڑیے کی مانند تیزی سے اپنے اصل روپ دھار لیتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ ایک دن ہمیں ہمارا چانس زور ملے گا۔

ہمگام: خانہ جنگی کے دوران کردوں نے سوریا میں اپنی حکومت قائم کی، اب ان کا اپنا عدالتی نظام ہے، ان کے اپنے ادارے ہیں، کیا یہ سب انہوں نے اکیلے کیا یا اس میں کوئی دوسری قوت نے ان کا ساتھ دیا؟

جواب: یہ سب انہوں نے خود تنہا کیا، تین سال پہلے میں وہاں گیا تھا، میں نے ان کا مشاہدہ کیا۔ مغربی کردستان کے رہنماوں کا تعلق فقط کردستان کے شامی علاقے سے نہیں بلکہ اس میں ایرانی کردستان، عراقی کردستان، ترکی کے کردستان کے لوگ بھی شامل ہیں۔ میں ان میں کچھ لوگوں کو ذاتی طور پر گزشتہ پچاس سالوں سے جانتا ہوں کیونکہ میں آزادی کی جہد میں شامل رہا ہوں۔ سوریا کی کردستان نے اب اپنی پارلیمنٹ بھی قائم کرلی ہے۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، کیونکہ یہ پارلیمنٹ تین علاقوں کے لیے ہے۔ اب کردستان کی علاقوں کو توسیع دے جاری ہے کرد چاہتے ہیں کہ تینوں علاقے آپس میں ضم ہو جائیں۔ مغربی کردستان عراق سے شروع ہو کر بحیرہ روم تک جاتا ہے۔ ترکی کو ہر سال امریکہ اور اسرائیل سے کروڑوں کے حساب میں امریکی ڈالر ملتے ہیں کیونکہ اس کے بارڈر ایران اور بحیرہ روم سے ملتے ہیں جو کہ اسرائیل سے بہت قریب ہے۔ شاید وہ امریکہ اور اسرائیل کیلئے ایران کی جاسوسی کر رہے ہیں، وہ ضرور کچھ تو کر رہے ہیں۔ اگر عراقی اور سوریائی کردستان متحد ہوئیں تو ایران اور بحیرہ روم کے ساتھ ہماری سرحدیں مل جائیں گی۔ ترکی کی نسبت ہمارا ایران کے ساتھ بارڈر بہت گہرا ہے اسی لیے کرد ایک متبادل قوت کے طور ابھریں سکتے ہیں اور کروڑوں کا یہ ڈالر ترکی کے بجائے کردوں کو مل جائیں گے۔ کرد علاقوں کو ضم کرنے کا منصوبہ میں نے عراقی کردستان کے صدر جناب مسعود بارزانی اور قندیل کے پہاڑوں میں پی کے کے نمائندوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسی طرح یہ تجاویز میں نے سوریا کے کردوں کے سامنے بھی پیش کیا۔ میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے اگر ہم سارے کرد علاقوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہوے تو سلمانیہ سے عراقی کردستان کے حولر شہر تک اور بحیرہ روم تک اگر ریلوے لائن بچھا گیا تو کرد ایران اور ترکی سے آزادانہ طور پر سفر کر سکیں گے۔

ھمگام: یعنی آپ یہ کہ رہے ہیں کہ اگر کرد متحد ہوے تو دنیا ترکی کے بجائے کردوں کی مدد کرینگے؟

جواب: جی ہاں بلکل درست فرمایا۔ ترکی نے پیش کش کی ہے وہ سوریا میں اپنی زمینی فوج کو بھیجے گی لیکن امریکہ نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ امریکہ نے ترکی سے کہا کہ کرد یہ کام تم سے بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔

ھمگام: بلوچستان میں آزادی کی تحریک کو کاونٹر کرنے کیلئے پاکستان نے اسلام کو استعمال کیا ہے کردستان عربوں کے گھیراؤ میں ہے، کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ عربوں نے اسلام کو آپ کی جہد کے خلاف استعمال کیا ہے؟ اور آپ کے خیال میں اسکی روک تھام کس طرح ممکن ہے؟

جواب: گزشتہ 1400 سالوں سے عرب، ایرانی اور ترک قوم کردوں کے خلاف اسلام کو استعمال کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ ہمارے تحریکیں کامیاب ہوئیں۔ جیسے کہ انیسویں صدی میں شہزادہ میر محمد نے راوندوز میں ترکی کی فوج کو شکست دے کر بھگا دیا۔ انکو شکست دینے کی وجہ اس کے پاس توپیں بنانے کی صلاحتیں تھیں۔ انیسوں صدی میں جب برطانیہ کی فوج عراق اور کردستان میں آئے تو انہوں نے شہزادہ محمد کے توپوں کو دیکھا تو ان کو یہ احساس ہوا یہ توپیں برطانیوی توپوں سے بہتر یں ہیں۔ یہ توپیں اب بھی بغداد اور کردستان کی میوزیموں میں موجود ہیں۔ شہزادہ محمد کی کامیاب حکمرانی کے بعد ترکی نے اسلام کو کردوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ ترکی نے مذہبی لوگوں کو کرائے پر کردستان بھیجا تاکہ کردوں کو یہ فتوی سنائیں کہ جو لوگ ترکی کے خلاف لڑتے ہیں شرعی لحاظ سے ان کی بیویوں کا ان سے طلاق ہو جاتا ہے۔ عراقی کردستان میں ایک ایسا قبرستان ہے جو 1400 سال پرانا ہے جسے اسلامی قبرستان کہتے ہیں اسکی لمبائی دو ہزار میٹر ہے۔ اب تصور کیجیے کہ جب اس قبرستان کی لمبائی دو ہزار میٹر ہے تو انہوں نے کتنے کردوں کو مار ڈالا ہو گا؟ مذہب کے نام انہوں نے کردوں کی نسل کشی کی ہے! انہوں نے کردوں، بلوچوں اور امازیغو کو بھی مارا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سیٹلائٹ تھا نہ کوئی کیمرہ نا کوئی دوسرے ریکارڈ کرنے والے ٹیکنالوجی تھی جو یہ دکھائے کہ کتنے ملین لوگوں کو انہوں نے مارا ہے۔ امازخوں کی مزاحمت تین سو سال تک جاری رہی جب اسلام نارتھ افریقہ پہنچا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیس سال تک جنگ جاری رہا۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ کتنے ملین لوگ اس جنگ کے دوران مارے گئے۔ ہمارے پاس اپنی قوم کو مضبوط کرنے کا ایک ہی راستہ ہے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کرد، بلوچ اور امازخ مسلمان ہیں یا نہیں، لیکن سب سے پہلے ان کو کرد، بلوچ اور امازخ ہونا ہو گا۔

ھمگام: کیا آپ کے خیال میں امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک بلوچ اور کرد آزادی کے تحریکوں کو سپورٹ کرینگے؟

جواب: امریکہ اور یورپ اپنا قومی مفاد اور تجارت دیکھتے ہیں میڈل ایسٹ میں ان کے پاس بائیس عرب ریاستیں ہیں۔ سابقہ سوبت یونیں میں سات ترکش ریاستیں ہیں جو تیل اور گیس سے مالا مال ہیں جو کہ یورپ کے ساتھ تجارت کر رہے ہیں۔ اب یہ یورپی ممالک بائیس عرب ملکوں اور سات ترکش ملکوں کو ناراض کر کے اپنی تجارت بند نہیں کرا سکتے۔ وہ کردوں اور بلوچوں کے آزادی کے بارے میں بلکل پریشان نہیں ہیں۔ وہ صرف اپنی مفاد اور تجارت کے بارے پریشان ہوتے ہیں۔ اگر ان کا کردستان اور بلوچستان کے اندر مفادات ہوں تو ہمیں سپورٹ کرینگے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم (کرد) ان ۲۲ عرب ممالک کے اثرات کو تبدیل کر سکتے ہیں تو شاید ہمیں سپورٹ دیں۔

ھمیں یہ جاننا چاھیے کہ ترکی ، سوریا اور ایران آپس میں تو بڑے اختلافات رکھتے ھیں مگر جب بھی بات کردوں کی آتی ھے تو یہ متحد ھوجاتے ھیں ۔ یہ قبضہ گیر ھمیں سپورٹ نھیں کرتے بلکہ اپنے مفادات دیکھتے ھیں۔ ھمیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ھیں!

ھمگام: اسرائیلی وزیر آعظم کے بیان کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں جو غالباً پہلا ریاستی سربراہ ہے جس نے آزاد کردستان کی حمایت کی؟

جواب: یہ اچھی بات ہے، لیکن کوئی کرد آزادی کے بارے سنجیدہ نہیں، خود اسرائیل بھی۔ 1991 سے ہم ایک ریاست ہیں عراق کے اندر، ہمارا ایک پارلیمنٹ ہے ہماری ایک فوج بھی ہے، ہمارے اجازت کے بغیر کوئی ہمارے علاقے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک ریاست ہیں۔ اگر وہ واقعی سنجیدہ ہیں آزاد کردستان کی حمایت کرتے تو انہیں پچیس سال پہلے کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اسرائیلی سفیر سے ان کی آزادی کی دن کے مناسبت سے 2016، 16 مئی میں ملاقات کی تھی۔ کرداشو کولیکر میں نے ان سے بات کی اور اپنا نیا کتاب بعنوان Kurdistan and Kurds under Syrian Occupation پیش کیا۔ اگرچہ وہ سرعام یہ نہیں بولتے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اور دوسرے یورپین ممالک ان کی حیثیت کو تسلیم کریں کہ فقط اسرئیل ہی مشرق وسطی میں اکیلا جمہوری ملک ہے۔ چونکہ اب کردستان ایک جمہوری ریاست ہے۔ اسرائیل سے بھی بہتر۔ اسی لیے میرے خیال میں اسرائیل بھی نہیں چاہتا کہ اس علاقے میں کوئی ریاست اس سے زیادہ جمہوریت پسند ہو۔ اسرائیل اس مد میں کرڑوں کے حساب میں امریکہ سے ڈالر ملتے ہیں اگر کرد ایک جمہوری ریاست کے حیثیت سے تسلیم ہوا تو یہ سارے پیسے کردستان اور اسرائیل کے درمیان تقسیم ہونگے۔ کئی عرصے پہلے اسرائیلی وزیر خارجہ کی وفد مجھے ملنے یہاں لندن آئی تھی، میں نے ان کو بتایا کہ ہماری قوم ہزاروں سال سے مصیبتیں جھیل رہے ہے اور اسی طرح آپ کی قوم بھی گزشتہ چار ہزار سالوں سے مصیبتوں سے گزر چکی ہے، میں نے سوچا ہے کہ اب آپ کا اپنا ایک ریاست ہے تو آپ مصیبت زدگوں کی مدد کرینگے قبضہ گیروں کی نہیں! لیکن آپ نے بحیثیت دوست ایران کی شاہ کو سپورٹ کیا، لیکن نئے ایران نے 1979 میں چوبیس گھنٹے کے اندر آپ کے خلاف دشمنی شروع کر دی، اب ترکی میں کردوں کے خلاف اسرئیل ترکی کا مدد کر رہا ہے۔ شاید آج کا رجب طیب اور دغان کل کے خمینی سے بھی زیادہ بدتر دشمن نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیوں ان غاصب قبضہ گیروں کی مدد کر رہے ہو جنہوں نے کردستان پر قبضہ جمائے رکھا ہے؟ اور کردوں پر ہونے والے ظلم وجبر کو نظر انداز کر رہے ہو؟ قدرتی طور ہم مصیبت زدگان کو ایک دوسرے کا مدد کرنا چاہیے!

ھمگام: تو پھر ان کا جواب کیا تھا؟

جواب: وہ پوچھنے لگے آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہمیں ایک ریاست بننے کیلئے کمک مت دیجیے گا، ہم اپنا ریاست خود تشکیل دیں گے لیکن میں کردستان کے جوان بیٹوں کو اسرائیل بھیجونگا آپ انہیں اچھا تعلیم دینے میں مدد کریں ٹریننگ اور ہنر سکھائیں تاکہ وہ اپنے آزاد ریاست کردستان کی بھاگ دوڑ سنبھال سکیں، میں نے ان کو ریس کی گھوڑے کی مثال دی، کہ اگر آپ کے پاس ریس کیلئے ایک گھوڑا ہے اور اسے بہت دیر تک روزانہ ریس کیلئے ٹریننگ اور اچھا کھانا نہیں دینگے تو اچانگ ایک دن ریس شروع ہونے سے پہلے اسے دس کیلو گرام کا کھانا دیکر اسکی ایک گھنٹے کا ٹریننگ کرواگے، تو گھوڑا ریس شروع ہونے سے پہلے ہی گر پڑے گا اور وہ ریس ہار جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سچ ہے لیکن ہمیں پہلے سے تربیت یافتہ گھوڑوں کی تلاش ہے، میں نے کہا کہ پہلے سے تربیت یافتہ یہ گھوڑے آپ کو گرادینگے اور آپ کا گردن ٹوٹ جائیگا۔ جیسا کہ شاہ ایران اور اردغان نے کیا۔ مگر آپ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے بھی ہچکچاتے ہیں۔

ھمگام: آپ بلوچستان کے ایک دوست اور حمایتی ہو، آپ کا کئی بین الاقوامی سفارت کاروں سے ملاقات ہوئی ہیں، تو کیا کبھی آپ نے ان کے سامنے بلوچستان کا ذکر کیا، بلوچستان کے بارے ان کے رائے کو جانا؟

جواب: میں نے کونسل آف اسٹولن کنٹریز کے بارے کئی ممالک کے صدر اور سربراہان کو خط لکھا اور ان کو میں نے یہ بتایا کہ نہ صرف کردبلکہ بلوچ، سندھی اور امازخ بھی مقبوضہ قومیں ہیں۔ آپ جانتے ہو کہ ہمارے ہاں کردستان میں ایک بڑا قبیلہ ہے جسے سندھی کہتے ہیں۔ میں نے پہلے بتایا کہ بلوچ اور سندھی کرد شامپائیر کے مشرقی محاذ کے حصہ رہے ہیں۔ آج بھی بدینان کے علاقے میں رہنے والے سب سے بڑا قبیلہ سندھی ہے۔ لندن میں میرے کئی دوست ہیں جو اپنے نام کے ساتھ سندھی لکھتے ہیں جیسا کہ محمد سندھی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ بلوچ کرد سندھی اور پشتون ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن 2500 سال پہلے جب مادا امپائیر کا سکوت ہوا تو ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئیں اور ہماری زبانیں بھی الگ شکلیں اختیار کر گئیں۔ حتی یہاں یوکے میں ولیم شیکسپیر کے تین سو سال پرانے لکھے ہوئے کچھ اوراق کے نسخوں کو لائیں تو یہاں انگلش لوگ انہیں پڑھ نہیں سکتے کیونکہ 300 سال بعد زبان کافی تبدیل ہو چکی ہے۔ اب تصور کیجیے کہ کیا تین ہزار سال بعد بھی بلوچی، کردی، سندھی اور پشتون زبانیں ایک ہی رہینگی؟ اس لیے میں زور دیکر کہتا ہوں کہ کرد اور بلوچ ایک قوم ہیں۔

ھمگام: صدر بارزانی کہتے ہیں کہ وہ جلد کردستان کی آزادی کیلئے ریفرینڈم کرائیں گے اس بارے آپ کا کیا خیال ہے، وہ کب اس کی تیاریاں شروع کریں گے اور کردستان کی آزادی کا اعلان کرینگے؟

جواب: دو ہزار پانچ میں عراقی کردستان میں ایک ریفرینڈم کیا گیا جس میں 98 فیصد لوگوں نے کردستان کی آزادی کے حق میں ووٹ دیا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی صدر بارزانی کیوں ایک اور ریفرنڈم چاہتے ہیں؟

ھمگام: اب آپ کیا سوچتے ہیں کہ وہ ایک اور ریفرنڈم کرا سکتے ہیں؟

جواب: میں نے پہلے بھی کہا کہ کوئی سنجیدگی نہیں، نہ مغرب والے نہ مشرقی اقوام اور نہ ہی اسرائیل، بلکہ خود کردوں کے لیڈرز بھی کردستان کی آزادی کیلئے سنجیدہ نہیں۔ ننانوے فیصد کرد قوم یہی چاہتی ہے کہ ان کا ملک آزاد ہو، لیکن کرد سیاسی پارٹیاں سوریا، ایران، عراق اور ترکی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے ان ریاستوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ یہ ریاستیں سوئے ہوئیں نہیں ہیں، یہ اپنے اچھے افیسروں کو کردستان کے تحریک کے اندر داخل کراتے ہیں اور یہ افسران بہت چالاک اور ہوشیار ہیں اچھا کردی زبان بول سکتے ہیں۔ دو ہفتوں کے اندر کردوں کے گاؤں کے لیڈر بن جاتے ہیں۔ یہ کوئی کرشماتی بات نہیں ہے۔ یہی وہ غیر سنجیدگی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اب انہیں ایک اور ریفرنڈم چاہیے، ہر دوسرے پانچ سال بعد وہ پھر کہتے ہیں کہ انہیں ریفرنڈم چاہیے۔، نہیں، یہ آزادی حاصل کرنے کا سنجیدہ طریقہ نہیں ہے۔ آزادی ایک ہی رات میں واقع ہونا چاہیے، یعنی اس کا فیصلہ ایک ہی اندھیری رات ہی میں ہونا چاہیے کہ آپ آزادی چاہتے ہو یا نہیں! مسود بارزانی کے پاس طاقت ہے، فوج ہے، پیسہ ہے، آزادی کیلئے سارے لوازمات موجود ہیں۔ زمین، افرادی قوت سب کچھ ہے، ہر چیز پر کنٹرول ہے۔ کچھ لوگوں نے ایک احتجاج میں سلمانیہ شہر کے وسط میں بارزانی کے سرخ پگڑی کو جلا ڈالا۔ بارزانی یزیدیوں کی طرح سرخ پگڑی پہنتے ہیں۔ تین سال پہلے میں نے ان سے ان کے ہیڈ کوارٹر میں جا کے ملاقات کی اور ان سے ذاتی طور پر کہا کہ مجھے امید ہے ایک دن آپ سلمانیہ کے وہی اسکوائر پر جاؤگے جہاں آپ کی قبائلی پگڑی جلائی گئی تھی اور یہ اعلان کروگے کہ آپ عراق اور کردستان کے سرحدی علاقہ میں حمرین کے پہاڑی پر جاکر کردستان کی آزادی کا اعلان کروگے اور یہ کہوگے اب یہ کردستان کا بارڈر ہے۔ تب پانچ کروڑ کرد آپ کی پیروی میں آپ کی سرخ پگڑی کو پہنے گے، صرف آپ کی ایک لفظ سے سب کچھ تبدیل ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی اس سرخ پگڑی کو نہیں جلائے گا۔

ھمگام: چلومان لیاکل اگر مسود بارزانی نے کردستان کی آزادی کااعلان کر دیاتو کیادنیااس کی حمایت کریگی،اور کیادنیاکے حمایت کے بغیر کرداپنا آزادی برقرار رکھ سکتے ہیں؟

جواب: کردوں کو پہلے اس کااعلان تو کرناچاہیے۔مثال کے طورپر آپ شادی کرناچاہتے ہیں مگر کسی کو بتانہیں سکتے تو کیادنیا کو پتہ ہوگا؟نہیں۔تم کو سب سے پہلے یہ بات خود کرنی ہوگی۔ مسعود بارزانی کو آزادی کااعلان کرناچاہیے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ دنیااس کی حمایت کریگی یانہیں۔اسرائیل امریکہ کابہترین دوست ہے،لیکن اسرائیل نے تل ابیب سے اپنے آزادی کااعلان کیاتھاناکہ نیویارک سے۔جب یہودیوں نے دیکھاکہ اسرائیل میں موجوداس وقت کا برطانوئی گورنر عربوں کی حمایت زیادہ کررہاہے توانہوں نے انہیں قتل کرڈالا۔گوکہ برطانیہ کا یہ گورنر مسٹر ہربرٹ سموئیل خود ایک یہودی تھا،لیکن انہوں نے اسے قتل کیاکیونکہ قومی مفادد وستی،ذاتی دوستی اور مفادات سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ میں چاہتاہوں کہ کرد اپنے مفادات کاتحفظ کریں،جی ہاں عراقی ہمارے دوست ہیں لیکن اگروہ ہمارے قومی مفاد کے خلاف کام کرینگے توانہیں روکناہوگا۔مطلب یہ کہ یہ کردوں کی ہی زمہ واری ہے کہ وہ اپنی آزاد کردستان ریاست کااعلان کریں۔ یہ کام ان کو خود کرنا ہوگا کرداس انتظار میں نہ رہیں کہ کوئی دوسرا آکران کی آزادی کااعلان کرے گا۔مجھے یادہے جب کروشیانے کہاکہ یوگوسلواکیہ سے وہ آزادی چاہتے ہیں توکسی نے ان کی حمایت نہیں کی تھی۔ سارایورپ، بشمول روم کے پادری نے ان کی مخالفت کی لیکن آپ جاکے تاریخ دیکھیں انہوں نے کس طرح اپنی ریاست بناڈالی؟ایک ہی رات میں انہوں نے اپنی آزادی کااعلان کردیااور ساری دنیاانکو حمایت دینے پر مجبور ہوئی۔ ہم کردوں، بلوچوں اور دوسرے اقوام کو بھی یہی کرناچاہیے، دوسروں کا بلکل انتظار نہیں کرناچاہیے۔یہ ہماری آزادی ہے،یہ ہمارامسئلہ ہے۔یہ ہمیں کرناچاہیے،یہ نہیں دیکھناچاہیے کہ کون خوش ہوگایاکون ناراض!

ھمگام: کردستان کی آزادی کی جہد میں عورتوں کی شمولیت کیسے ممکن ہوئی؟اس شمولیت نے تحریک کو کس طرح متاثر کیاہے؟

جواب: کرد عورتوں نے تحریک کو بہت پہلے سے جوائن کیاہے یہ آج کی بات نہیں۔مثال کے طور پر عدیلہ خانم جوکہ کردستان میں جاف قبیلہ کی لیڈر تھیں انہوں نے کردستان میں برطانیہ کی گورنر سے 1919 میں ملاقات کی۔اسی 1919 کے زمانے میں برطانیہ میں عورتوں کو پارلیمنٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی،لیکن اسی دور میں ہمارے یہاں ایک کرد عورت ہمارے ایک قبیلے کی لیڈر تھی۔ ہم برطانیہ سے اس وقت بہت زیادہ تہذیب یافتہ تھے۔
سوال: لیکن کس چیزنے انہیں کرد آزادی کی جنگ میں شمولیت پر مجبور کیا، کیا یہ جبر کی وجہ سے یا ترقی پسندانہ زہنیت کی بدولت ایسا ممکن ہوا؟
جواب: مجھے یادہے ایک جاندرک نامی محترمہ تھیں،پہلا جاندرک ایک فرنچ تھیں،لیکن کردستان میں بھی ایک جاندرک نامی محترمہ تھیں۔وہ ایک بہت مشہور جنگجو تھیں اور 1963 کی کردستان کی انقلاب کا وہ ایک پیشمرگہ تھیں۔ بہت سے عورتوں کو عراقی حکومت نے سزائے موت دیکر پھانسی پر لٹکایا۔کرد طلبہ لیلا قاسم کو 1974 میں عراق میں پھانسی دی گئی۔میری ان سے 1972 میں ملاقات ہوئی تھی انہوں نے اپنی تمام قومی کرد ملبوسات مجھے ہدیہ کیں تاکہ میں انہیں ایک شامی کرد لڑکی کوامانتً دے دوں۔میں نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔سوہمارے یہاں کرد عورتوں کی تحریک میں شمولیت زمانے سے چلاآرہی ہے لیکن اب تحریک میں عورتوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کرد آزادی کیلئے بھوکے اور پیاسے ہیں۔

ھمگام: کیاآپ کو کرد عورتوں کی تحریک میں شامل کرنے میں مشکلات کاسامناتھا؟انہوں نے تحریک میں کیسے جگہ پائی؟کیااس کی وجہ ارتقائی عمل تھی یاتحریکی ڈھانچے کے ذریعے اس کام کوانجام دیاگیا؟

جواب: کردش سماج میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں،ہمارے لوگ انتہاپسند مسلمانوں کی طرح نہیں ہیں جہاں عورتیں اپنی چہروں کو چھپاتی ہیں، کرد گاؤں میں عورتیں مہمان نوازی مردوں کی طرح کرتی ہیں، مردوں کو ان پر پورا بھروسہ ہے۔

ھمگام: کردوں کے نظروں میں تحریک کا کونساطریقہ کارزیادہ موثر ہے یعنی مسلح جدوجہد یاسیاسی سفارت کاری؟

جواب: مزاحمت سب سے زیادہ موثر ہے کیونکہ جب آپ اپنے حقوق کیلئے جنگ کرناشروع کردیتے ہیں توسیاست اور سفارتکاری بہت آسان ہوجاتاہے۔مزاحمت کے بغیر آزادی حاصل کرنابہت مشکل ہے!

ھمگام: عبداللہ اوجلان کی حراست نے کرد تحریک کو کس طرح متاثر کیاہے؟

جواب: عبداللہ اوجلان ایک کرد لیڈر ہے، دوسرے لیڈروں کی طرح اس سے بھی کچھ غلطیاں ہوئیں۔ عبداللہ ترکی سے لڑا ہے اور سوریا نے اسے سپورٹ دی ہے عبدالرحمان گسملو خمینی کے ایران سے لڑا ہے عراق نے اسے سپورٹ کیا، بارزانی اور طلبانی عراق سے لڑے ہیں، ان کو ایران سے سپورٹ دی گئی تھی۔ 1975 میں مسعود بارزانی کے والد مصطفی بارزانی کا انقلاب 24 گھنٹے کے اندر منہدم ہوگیا۔ ڈاکٹر گسملو کا ایرانی کردستان میں انقلاب بھی ختم ہوا جب اس کا 1989 میں ویانا میں قتل ہوا۔ عبداللہ اوجلان کی تحریک شاندار تھی، لیکن اس کی گرفتاری کے بعد اس کا گروپ سکڑ گیا۔ مثال کے طور پر جب عبداللہ گرفتار ہوتا ہے تو جرمنی میں ایک لاکھ افراد ان کے گروپ کے حمایت میں مظاہرے میں شامل ہوتے ہیں۔ میں نے جرمن پولیس کے ایک رپورٹ کو پڑھا جس میں یہ اعتراف تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی دفعہ جرمن پولیس کو پی کے کے اس مظاہرے کو کنٹرول کرنے کیلئے ایسی ایمرجنسی نافذ کرنا پڑی تھی۔ یہ گروپ یورپ اور کردستان میں بہت مضبوط تھا یہ گروپ اب بھی مضبوط ہے لیکن اس کی گرفتاری کے بعد پہلی والی مضبوطی نہ رہی۔ مجھے امید ہے کہ اب کرد سیکھ چکے ہیں کہ ایک قبضہ گیر سے کمک لیکر دوسرے قبضہ گیر کے خلاف لڑنا کوئی نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ نتیجہ صفر ہی رہے گا۔ جیسا کہ ڈاکٹر گسملو اور عبداللہ اوجلان کے تمام کوششیں راہیگاں گئیں! بارزانی کردستان چھوڑ کر امریکہ گیا اور گسملو مارا گیا اور اوجلان اب بھی جیل میں ہے۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ترکی، سوریا اور ایران آپس میں تو بڑے اختلافات رکھتے ہیں مگر جب بھی بات کردوں کی آتی ہے تو یہ متحد ہوجاتے ہیں۔ یہ قبضہ گیر ہمیں سپورٹ نہیں کرتے بلکہ اپنے مفادات دیکھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں!

ھمگام: آپ اپنے جدوجہد کے بارے کس چیز سے سب سے زیادہ خوش ہیں؟ وہ کونسی سب سے اچھی چیز ہے جسے آپ کی لوگوں نے حاصل کیا ہے؟

جواب: مجھے کرد جنگجو عورتوں پر فخر ہے۔ اس وقت مجھے بہت خوشی ہوئی جب میں نے کمیش لی کے علاقے میں دورے کے دوران ایک 15 سالہ کرد لڑکی کو دیکھا جو اپنی ملک اور لوگوں کے دفاع کیلئے مسلح تھی! سوریا اور عراق میں کردوں کیلئے اچھا موقع ہے کہ وہ جرات کرتے ہوے اپنی آزادی کا اعلان کرلیں۔

ھمگام: کردوں کے درمیان کس طرح کے اختلافات کیا ہیں؟ اور ان کے درمیان یہ اختلافات کیوں ہیں؟

جواب: جہد کے بارے کوئی اختلافات نہیں ہیں۔ کرد پارٹیاں کردوں کے حقوق کو ایرانی، عراقی اور ترکش فریم ورک کے اندر رہتے ہوے ایک حل کی تلاش میں ہیں۔ میری تنظیم کردستان نیشنل کانگریس کا صرف ایک ہی ڈیمانڈ ہے اور وہ ہے کردستان کی آزادی! ہم ان قبضہ گیروں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ یہ قومیں جو ہمارے قرب وجوار میں رہتے ہیں وہ بڑے وحشی ہیں وہ ہمارے لوگوں کو قتل کررہے ہیں! ہم اس غلامی کے جرم وذلت کے ساتھ ایک دن بھی رہنا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں نے ہمارے لوگوں کو نفسیاتی طور پر تباہ کردیا ہے۔ یہ ہمارے زبان کو بھی تباہ کررہے ہیں۔ ہماری تمام مصائب کا واحد حل ہماری آزاد ریاست میں ہے۔

ھمگام: آپ نے اپنی کلچر کو کس طرح زندہ رکھا ہے؟

جواب: ہمارے دو عظیم سپہ سالار ہیں انہوں نے ہمارے زبان اور کلچر کو زندہ اور محفوظ رکھا ہے۔ ایک ہمارے پہاڑ ہیں اور دوسرے ہمارے کردمائیں ہیں! ہمارے ماؤں نے کبھی بھی دوسرے زبانوں میں ایک لفظ تک نہیں بولی۔ انہوں نے صرف کردی زبان بولی ہے۔ تاکہ ہماری زبان کا تحفظ ہو!

ھمگام: کیا آپ بلوچوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: مجھے انتظار ہے کہ ہم کب اکھٹے کام کرسکیں گے، میں اس وقت ایک سیٹلائٹ ٹی وی چینل کیلئے سخت محنت کررہا ہوں تاکہ اس میں کردش، بلوچی اور اماز خی زبانوں میں ہم اپنی آزادی کی آواز کو دنیا کو سنا سکیں! موجودہ دور میں ہمارے یہاں سوسے زیادہ کرد زبان میں ٹی وی چینل ہیں۔ لیکن یہ سب خود مختاری اور وفاقی نظام کے طلب گار ہیں۔ ہم صرف ایک ہی ٹی وی چینل کردوں بلوچوں اور اماز خوں کیلئے چاہتے ہیں تاکہ جس کے زریعے ہم اپنی آزادی کا طلب کرسکیں۔ مجھے یقین ہے اگر ہمیں اس طرح کا ایک سہولت میسر ہوا تو ہم کچھ ہی سالوں میں بہت اچھے نتائج حاصل کرسکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ کرد اور بلوچ رہنما اپنی عوام کی آزادی کی خواہش کو لیکر ہی چلیں گے۔ بحیثیت ایک کرد میرا سو فیصد آزادی کا مطالبہ ہے، اور مجھے یقین ہے کہ بلوچ بھی اپنے لیے یہی چاہتے ہیں۔

توار ''کا صحافتی سفر''

خادم لھڑی

جرمنی میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی تحریک نے جب 1970 کی دہائی میں زور پکڑ لیا۔ اور ''ہائٹ ہائن ہوف'' گروپ نے مسلح جدوجہد کے ذریعے سماجی ڈھانچے کو بدلنے کیلئے تحریک چلائی۔ تو زوال پذیر معاشرتی اقدار سے بیزار نوجوانوں کی تیزی سے اس تحریک میں شمولیت نے تحریک کو بام عروج پر پہنچایا۔ تحریک کی اس مقبولیت کے پیش نظر حکمران طبقے نے اس کو کاؤنٹر کرنے کیلئے ایک جانب مخبروں، جاسوسوں، سرکاری عہدیداروں اور مقامی ایجنٹوں کے ذریعے تحریک سے وابستہ لوگوں کی نگرانی کرنے اور ساتھ ہی ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنی شروع کردی، تو دوسری جانب اخبارات اور پولیس کے ذریعے جرمن معاشرے میں عوامی رائے کو بدلنے کے ساتھ تشدد کا راستہ اپنایا۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سرکاری حمایت یافتہ اخبار ''بلڈ'' نے سنسنی خیز خبریں شائع کرنے کے ساتھ ہر حکومت مخالف کو روسی ایجنٹ اور ملک دشمن قرار دے دیا۔ نوبل انعام یافتہ جرمن ادیب و قلم کار ''ہائنرش بال'' نے زرد صحافت اور میڈیا کی اس سستی صحافتی کردار کے پس منظر میں ایک ناول ''کھیتا رینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت'' لکھ کر صحافتی بددیانتی کے حقائق کی نشاندہی کی۔ (اس ناول کا اردو ترجمہ مورخ ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے۔) بلوچستان میں بھی 1996ء سے شروع ہونے اور تقریباً 2000ء میں تیزی سے نمایا ہونے والی بلوچ قومی تحریک کی بناء پر یہی صورتحال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جرمنی میں سماجی ڈھانچے کی تبدیلی کی تحریک چل رہی تھی۔ اور جس کی قیادت بائیں بازو کے حمایت یافتہ لیڈران کر رہے تھے، جبکہ بلوچستان میں تحریک کی بنیاد نیشنلزم پہ رکھی ہوئی ہے۔ اور یہ ''بلوچ قومی آزادی'' کی تحریک ہے۔ جس کی قیادت بلوچ قوم دوست رہنماء کر رہے ہیں۔ بلوچستان میں بھی میڈیا کا کردار اس سلسلے میں نہ صرف شروع دن سے حقائق کی نفی کرتا رہا ہے، بلکہ آج بھی بلوچستان حوالے میڈیا اسی ڈگر پہ چل رہا ہے۔ اور میڈیا کے نمائندے حکمرانوں کے اشاروں پر ناچتے ہوئے، حق بات کرنے اور قومی تحریک سے جُڑے بلوچ فرزندوں کو انڈیا اور اسرائیل کا ایجنٹ قرار دینے کے درپے ہیں۔ اسی صورتحال کے پیش نظر حقیقی صحافتی اصولوں پر مبنی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ''توار'' کو 9 اگست 2004ء کو روزنامہ اخبار کی صورت میں ضلع مستونگ سے ڈکلریشن لیکر ماہنامہ سے روزنامہ کی صورت میں کراچی سے شائع کرنا شروع کردیا گیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل ستمبر 1991ء سے شروع کیا گیا ''توار'' بلوچی اور براہوئی زبانوں میں شائع ہونے والا ایک ماہنامہ رسالہ تھا۔ بلوچ کی آواز و بلوچستان بارے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے کیلئے ادارہ ''توار'' کے پلیٹ فارم سے ایک ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے میں نے اور میرے ساتھ شامل توار ٹیم نے اس کام کا بھیڑا اپنے کندوں پر اُٹھایا۔ کیونکہ بلوچستان کے حوالے سے پاکستانی میڈیا سراسر جانبدارانہ صحافتی رویے سے بلوچستان میں حالات کے حقیقی رُخ کو پیش کرنے کی بجائے ''بلڈ'' کی طرح حکمرانوں کی ایماء پہ غلط رنگ دیکر پیش کر رہا تھا۔ اور عالمی سطح پر ''بلوچ قومی تحریک آزادی'' کو علحیدگی پسندی کی تحریک ثابت کرنے کی تگ و دو میں تھا، اور ہے۔

بلوچستان میں فورسز و خفیہ اداروں کی کاروائیوں، بلوچ عوام پہ روا رکھنے والے ظلم و جبر اور بلوچوں کو اُٹھا کر لاپتہ کرنے اور بعد ازاں ان کی مسخ اور تشدد زدہ لاشیں پھینکنے جیسے واقعات کو پاکستانی میڈیا بریکنگ نیوز بنانا تو درکنار ایک سنگل کالم میں شائع کرنے اور الیکٹرانک میڈیا معمولی خبر بنا کر پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ''بلوچستان میں سب اچھا'' کا رٹہ لگا کر حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس لئے ''توار'' نے اپنی اشاعت کے روز اول سے ''بلوچستان مسئلے'' کو اجاگر کرنے اور حقیقی صحافتی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر زمینی حقائق کو سامنے لانے کا کام شروع کیا۔ اور بلوچستان مسئلے کو کوریج دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے روز نامہ توار معتوب ٹھرا۔ اور مکمل طور پہ خفیہ اداروں کے ریڈار پہ آگیا۔ اور پھر توار کی اشاعت کو روکنے اور اس ادارے کو مکمل طور پہ ختم کرنے کیلئے مختلف حربے آزمائے جانے لگے۔ کوئٹہ میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر انوار شاہ نے ایک دوست کے ذریعے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر پہلے تو اشتہارات کی مد میں کروڑوں روپے ملنے کا لالچ دیا جب میں نے ان سے کہا کہ ''توار کی آڈٹ نہیں ہوئی ہے اور اگر آڈٹ بھی ہو تو میڈیا لسٹ پہ توار کو آنے کیلئے اس کی مطلوبہ فگر کم ہے'' تب اس نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اس کے باوجود بھی جب میں نے قوم پرستوں کو کوریج دینے کا اقرار کیا تو اس نے مجھے سخت نتائج کی دھمکی دی۔ اور تنبیہ کیا کہ '' اگر آئندہ توار نے قوم پرستی کے رجحانات پر مبنی مضامین و خبروں کو کوریج دی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔'' ازاں بعد توار کے ڈکلریشن کو منسوخ کرنے کیلئے کوئٹہ کلب (کوئٹہ کینٹ) میں ایک میٹنگ بلائی گئی۔ جس میں تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر، سیکریٹری انفارمیشن بلوچستان، میڈیا کے چند مخصوص نمائندوں کے علاوہ آئی ایس آئی اور ایم آئی کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ بحث و کافی تکرار کے بعد اس بناء پر توار کے ڈکلریشن کو منسوخ کرنے کا فیصلہ نہ ہوسکا کہ اس طرح سے میڈیا سے منسلک تنظیمیں اس کو ایک اشو بنا کر احتجاج شروع کریں گے۔ (اس کے علاوہ مجھے قتل کی دھمکیاں دینے، پارلیمانی قوم پرستی کے دعویدار سیاسی پارٹیوں کے ذریعے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنے، توار کے خلاف کروڑوں روپے کے حرجانے کے عدالتی نوٹس جاری کرنے اور بہت سے دیگر طریقے و حربے استعمال کئے گئے۔ جن کی تفصیل مناسب موقع پر سامنے لاؤنگا۔) ان تمام حربوں کے باوجود جب توار سے وابستہ صحافی دوستوں نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ تب روز نامہ ''توار'' سے وابستہ سینئر صحافی حاجی رزاق بلوچ، جاوید نصیر رند، لالہ حمید بلوچ اور رزاق گل کو اصولی و حقیقی صحافت اور سچ لکھنے کی پاداش میں پہلے لاپتہ کردیا گیا۔ اور بعد ازاں کئی ماہ زیر حراست رکھنے اور خفیہ اداروں کے ٹارچر سیلوں میں تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ان کی تشدد زدہ مسخ لاشیں پھینکی گئیں۔ اسی طرح توار سے منسلک صحافیوں منیر شاکر اور عبدالحق بلوچ، جن کا تعلق خضدار سے تھا کو ٹارگٹ کرکے قتل کردیا گیا۔ تاکہ از خود توار کی اشاعت بند ہوجائے۔ لیکن توار سے وابستہ دوستوں نے اپنے مقدس پیشے کی لاج رکھتے ہوئے تمام تر ظلم و جبر کا ہمت سے مقابلہ کیا۔ اور توار کی آواز کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی اشاعت کو باقاعدگی سے جاری رکھا۔ اور اپنی صحافیانہ کام کو جاری رکھا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر سچ لکھنے اور حقائق کو آشکار کرنے کی اتنی بڑی سزا دینے کے پس پشت وہ کیا محرکات ہیں۔ جن کی وجہ سے پاکستان جیسا ملک توار جیسے ایک چھوٹے سے ادارے سے خوف محسوس کرتا ہے؟ کیا محض بلوچستان کی صورتحال و حقائق سامنے لانے اور صحافتی اصولوں پر کاربند رہنے کی اتنی بڑی سزا دی جاتی ہے کہ ہم سے ہمارے جینے کا حق چھین لیا جاتا ہے؟ کیا واقعی پاکستان جیسے ایٹمی طاقت کو ہمارے اخبار سے خطرہ لاحق ہے؟

بلوچ قوم کی جانب سے ہماری سرپرستی نے ہمارے حوصلوں کو بڑھایا۔ اور ہمیں سہارا دیا۔ اس پر بھی قدغن لگانے کیلئے مختلف حربے آزمائے گئے۔ تاکہ توار کی اشاعت ممکن نہ ہو۔ لیکن آج بھی توار کو بلوچ قوم کے فرزندوں کی مالی و ہر قسم کی اعانت حاصل ہے۔ صحافت کے حوالے سے پوری دنیا میں پاکستان حساس ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ حقیقی صحافت یہاں انتہائی تشویشناک صورتحال سے دوچار ہے۔ یہاں پر صحافی برادری کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں 114 سے زائد صحافیوں کو ابدی نیند سلا دیا گیا ہے۔ ان شہید ہونے والے 114 صحافیوں میں سے 41 کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ توار وہ واحد ادارہ ہے۔ جس سے منسلک صحافیوں کو شہید کرنے کے ساتھ دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں صحافت کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کو مختلف اطراف سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جن میں حکومت، سیاسی پارٹیوں اور خفیہ اداروں کا پریشر شامل ہے۔ ریاست اور اس کے اداروں کے علاوہ سیاسی پارٹیاں صحافیوں سے قلم چھین کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے کوئٹہ کے 11 اخبارات کے خلاف انسداد دہشتگردی کے مقدمات درج ہیں۔ جس میں کسی کی ضمانت بھی نہیں ہوسکتی۔ صحافی فرائض کی ادائیگی کے دوران حکومت و ریاستی اداروں، مزاحمتی تنظیموں، سیاسی

جماعتوں، مسلح مذہبی ونگزاور عدلیہ کی جانب سے لگائی جانے والی قدغن کا سامنا کرتے ہیں۔ قلم توڑ دی گئی ہے، لب سی لئے گئے ہیں، تشدد کے بھاری بھر کم چٹان کے نیچے صحافی پھر بھی خود کی سانسوں سے زیادہ حقیقی صحافت کی روح کو بچانے کی اپنی کوششوں میں مرگ وزیست کی کش مکش میں ہیں۔ بلوچستان میں ان چند سالوں میں اس وقت تک جو صحافی اپنی صحافتی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے شہید ہوئے ہیں،ان میں سے چند ایک کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ خادم حسین شیخ، جو سندھ ٹی وی سے منسلک تھے۔ ان کو 14 اپریل 2008 کو حب چوکی میں قتل کیا گیا۔ وصی احمد، جو روزنامہ آزادی اور بلوچستان ایکسپریس سے منسلک تھے۔ان کو 16 اپریل 2009 کو خضدار میں قتل کیا گیا۔ لالہ حمید بلوچ جو روزنامہ انتخاب اور روزنامہ توار کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو تربت کے قریب 18 نومبر 2010 کو قتل کیا گیا۔ محمد سرور، جو آج ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو 3 ستمبر 2010 کو کوئٹہ میں قتل کیا گیا۔ ملک عارف، جو سماء ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے ۔ان کو 16 اپریل 2010 میں کوئٹہ میں قتل کیا گیا۔ اعجاز رئیسانی بھی سماء ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو 6 ستمبر 2010 کو کوئٹہ میں قتل کیا گیا۔ الیاس نظر، جو طالبعلم تھا اور بلوچی رسائل کے ساتھ منسلک تھا۔ ان کو 3 جنوری 2011 کو قتل کیا گیا۔ عبدوست رند جو فری لانس جرنلسٹ تھے۔ ان کو 18 فروری 2011 کو تربت میں قتل کیا گیا۔ منیر شاکر، جو کہ روزنامہ توار، آن لائن نیوز نیٹ ورک اور سبز بات بلوچستان ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو خضدار میں 14 اگست 2011 کو قتل کیا گیا۔ جاوید نصیر رند جو روزنامہ توار کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو نومبر 2011 میں قتل کیا گیا۔ رزاق گل جو کچھ عرصے تک توار کے ساتھ منسلک رہے۔ اور ازاں بعد ایکسپریس ٹی وی کے ساتھ منسلک ہوئے۔ ان کو 19 نومبر 2012 کو تربت میں قتل کیا گیا۔ عبدالقادر حاجیزئی جو وش ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو 28 مئی 2012 کو کوئٹہ میں قتل کیا گیا۔ عبدالحق بلوچ، جو کہ ARY ٹی وی اور روزنامہ توار کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو 29 ستمبر 2012 کو خضدار میں قتل کیا گیا۔ رحمت اللہ عابد، جو دنیا ٹی وی اور روزنامہ انتخاب کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو 18 نومبر 2012 کو پنجگور میں قتل کیا گیا۔ سیف الرحمن بلوچ جو کہ سماء ٹی وی کے ساتھ منسلک تھے۔ 10 جنوری 2013 کو کوئٹہ میں بم بلاسٹ میں ہلاک ہوئے۔ اور رحمت اللہ شاہین جو کہ روزنامہ توار کے ساتھ منسلک تھے۔ ان کو خفیہ ایجنسیوں نے پہلے تو حراست میں لیکر لاپتہ کر دیا۔ اور ازاں بعد مچھ کے قریب ان کی مسخ شدہ لاش ملی۔ اس کے علاوہ بہت سے اور صحافی تھے جن کی تفصیل اس وقت میرے پاس نہیں۔ البتہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان کی بھی تفصیل لکھوں، البتہ کچھ صحافی ایسے بھی ہیں۔ جو اپنی ہی برادری کے سامنے دیوار بنتے ہوئے ریاستی ایجنڈے کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اور سیاسی پارٹیوں وادارں کے مقاصد کو لیکر زرد صحافت کو ہوا دے رہے ہیں۔

بلوچستان میں آئے روز کے فوجی آپریشن، عام انسانی آبادیوں کو نذر آتش کرنا، لوگوں کو حراست بعد لاپتہ کرنا، لاپتہ افراد کی تشدد زدہ مسخ لاشیں ویرانوں میں پھینکنا، لاپتہ افراد کو جعلی مقابلوں میں گولیوں سے چھلنی کرنا اور اس جیسے غیر انسانی وانسانی حقوق کی سنگین و تشویشناک خلاف ورزیاں معمول بن چکی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کسی بھی نیوز پیپر یا نیوز چینل میں رپورٹ نہیں ہوتیں۔ ماسوائے بلوچستان کے ایک دو نیوز پیپر و آن لائن ویب سائٹ کے جو بلوچستان میں حقیقی و سچی صحافت کا اپنا فریضہ نبھا رہے ہیں۔ گزشتہ سال صحافت کے عالمی دن کے موقع پر بلوچستان کے سینئر صحافیوں نے مظاہروں، جلسوں اور تقریبات کے دوران حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے والے 24 صحافیوں کے قتل کی تحقیقات کیلئے جوڈیشل کمیشن قائم کیا جائے۔ اور اخبارات کے خلاف انسداد دہشتگردی کے مقدمات ختم کئے جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اگر کسی صحافی سے کسی جماعت یا ونگ یا سرکاری طور پہ کوئی جانبداری کی شکایت ہے۔ وہ صحافیوں کی متعلقہ تنظیموں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ صحافی ہر موقع پر اپنا احتساب کروانے کیلئے تیار ہیں۔'' لیکن افسوس اس پر آج تک عملدرآمد نہ ہو سکا۔ بلوچستان میں دو سالوں میں 41 سے زائد صحافی اپنے فرائض منصبی کے دوران شہید ہو چکے ہیں۔ جبکہ متعدد صحافی اپنے جان کی تحفظ اور قتل کی دھمکیوں کے بعد بلوچستان چھوڑ کر دیگر علاقوں اور بیرون ملک منتقل ہو چکے ہیں۔ بہت سے لاپتہ صحافی آج بھی ریاستی اداروں کی تحویل میں غیر انسانی تشدد سہہ رہے ہیں۔ خدا جانے زندہ بھی ہیں۔ یا خدانخواستہ..... آزادی صحافت اور بلوچستان میں ریاستی جبر کا پردہ چاک کرنے میں روزنامہ ''توار'' وہ واحد ادارہ ہے۔ جس نے ایک موثر آواز بلند کی۔ اور اس کی بھاری قیمت توار کو چکانا پڑی۔ مجھے قتل کرنے اور برے انجام سے دوچار کرنے کی دھمکیوں کے علاوہ کراچی میں نٹھی جھٹی پل کے قریب مجھ پہ اور میرے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ لیکن ہمارے اور قاتلوں کے گاڑی کے درمیان ایک ٹرک کے اچانک آجانے سے ہم دونوں بچ گئے۔ توار کے دفتر کو جلایا گیا۔ اور پارلیمانی پارٹیوں BNP اور نیشنل پارٹی کے ذریعے تریٹ کیا گیا۔ بی این پی کے کراچی کے کارکنوں نے زاہد بلوچ کی قیادت میں توار کے دفتر پر رات کے وقت حملہ کیا۔ اور توڑ پوڑ کی ۔اسی طرح نیشنل پارٹی کی قیادت نے مرحوم مولا بخش دشتی کے بیٹے کے ذریعے توار پر پانچ کروڑ روپے کے ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا۔ لیکن ازاں بعد کیس میں کمزور پہلوؤں کی بنیاد پر کیس واپس لے لیا۔ اسی طرح ایک کشمیری وکیل نے جو کہ کراچی کورٹ میں وکالت کرتا تھا۔ اس بناء پر توار پر مقدمہ دائر کیا کہ توار کے مونو گرام پر صرف بلوچستان کا نقشہ کیوں بنا ہوا ہے۔ اس میں پاکستان اور کشمیر کا نقشہ کیوں نہیں ہے۔ اور پھر خضدار سے تعلق رکھنے والے ایک کیبل مالک نے بی این پی کی ایماء پر توار پر کیس دائر کیا۔ اس کا وکیل بی این پی سے تعلق رکھنے والے سابق ایم این اے عثمان بلوچ تھے۔ لیکن بعد میں خود عثمان بلوچ نے اس کیس میں دلچسپی نہیں لی۔ توار کے ایڈیٹوریل پیج کے ایڈیٹر، سینئر صحافی اور کالم نگار جاوید نصیر رند کو 10 ستمبر 2011 کو خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے حب سے حراست میں لیکر لاپتہ کیا۔ اور توار کے دیگر اسٹاف اور مجھے فون پہ دھمکیا موصول ہونے لگیں۔ اس واقعہ کے بعد ادارے کے ہیڈ آفس کو جو سنی پلازہ نزد ٹیکنو سٹی حسرت موہانی روڈ پہ واقع تھا فوری طور پہ بند کر کے لیاری کے بلوچ ایریا میں شفٹ کرنا پڑا۔ اور ہم نے کافی عرصے تک اپنے دفتر کو خفیہ رکھا۔ اور پھر 5 نومبر 2011 کو جاوید نصیر کی مسخ و تشدد زدہ لاش خضدار کے علاقے گزگ سے برآمد ہوئی۔ اس کے بعد چار سال تک ہم لیاری میں اپنے آفس کو ہر چند ماہ بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہے۔ جب بھی ہمیں خفیہ اداروں کی نگرانی کا شک محسوس ہوتا۔ ہم فوری طور پہ اپنا آفس تبدیل کرتے تھے۔ اسی شفٹنگ کے دوران 2012 میں جب ہم نے ایک نئی جگہ اپنا آفس شفٹ کیا۔ تو اس دوران توار کے نیوز ایڈیٹر عمران فاکر کو دھمکی آمیز فون کالز اور پیغامات موصول ہوئے۔ تو اس نے توار سے علحیدگی اختیار کر لی۔ اور اس کے بعد یہ ذمہ داری جاوید سعید نے سنبھالی۔

حاجی رزاق نے جو اس سے قبل بھی بطور سب ایڈیٹر توار میں کام کرتا رہا تھا۔ اور درمیان میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بناء پہ توار میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسٹاف کی کمی کی وجہ سے ادارے کی جانب سے ریکیوسٹ پہ دوبارہ سے توار میں جنوری 2013 سے بحیثیت سب ایڈیٹر و پروف ریڈر کام شروع کیا۔ اور رزاق سربازی نے بھی اس دوران دوبارہ سے توار میں بطور سیکنڈ نیوز ایڈیٹر کے کام شروع کیا۔ اس دوران حاجی رزاق اکثر کہا کرتے تھے کہ توار میں کام کرنے سے قبل بھی خفیہ اداروں کے اہلکار میرا پیچھا کرتے تھے۔ اب بھی میرا پیچھا کرتے ہیں۔ اور پھر 24 مارچ 2013 کو آفس آتے ہوئے خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے حاجی رزاق کو حراست میں لیکر لاپتہ کر دیا۔ 6 اپریل 2013 کو رات دو بجے کے بعد جب کام ختم کر کے توار کا اسٹاف اپنے گھروں کو چلے گئے۔ توعینی شاہدین کے

بلوچستان میں دو سالوں میں 41 سے زائد صحافی اپنے فرائض منصبی کے دوران شہید ہوچکے ہیں۔ جبکہ متعدد صحافی اپنے جان کی تحفظ اور قتل کی دھمکیوں کے بعد بلوچستان چھوڑ کر دیگر علاقوں اور بیرون ملک منتقل ہوچکے ہیں۔ بہت سے لاپتہ صحافی آج بھی ریاستی اداروں کی تحویل میں غیر انسانی تشدد سہہ رہے ہیں۔ خدا جانے زندہ بھی ہیں۔ یا خدانخواستہ ....

مطابق چار گاڑیوں پر مشتمل خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے آکر توار کے آفس کے تالے توڑنے کے بعد کمپیوٹر، کتابیں، جینز پیٹر، پرنٹر، ضروری دستاویزات اُٹھا کر لے گئے۔ اور باقی سامان کو دفتر سمیت آگ لگادی۔ اور پھر دو ماہ تک توار کا کام بند رہا۔ 26 جون 2013 کو نئے آفس میں توار کا کام دوبارہ شروع ہوا۔ اور 20 اگست 2013 کو حاجی رزاق کی مسخ شدہ لاش کراچی کے علاقے سرجانی ٹاؤن سے برآمد ہوئی۔ اور اب بھی ہم ہر دو ماہ بعد اپنا دفتر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی خفیہ اداروں کے اہلکار ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ روزنامہ توار پہ سائبر اٹیک توروز کا معمول ہے۔ توار کی کاپیوں کو بک اسٹالوں اور پریس سے اُٹھا کر غائب کرنا، پریس کے مالک کو توار کی کاپیاں پرنٹ نہ کرنے کیلئے دھمکانا، ہاکروں کو تھریٹ کرنا شروع دن سے توار کے ساتھ روا رکھنے والے سلوک ہیں۔ ریاستی تھریٹ اور حربوں کی وجہ سے میں اپنی فیملی کے ساتھ گزشتہ پانچ سالوں سے ملک سے باہر مہاجرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اسی طرح توار کے نیوز ایڈیٹر جاوید سعید گزشتہ دو سالوں سے نیپال میں مہاجر کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ اور رزاق سربازی بھی ملک سے باہر سویڈن میں ہیں۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے واقعات ہیں جن کی تفصیل مناسب وقت پر کیا جائے گا۔ غرض روزنامہ توار کو مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن آج بھی ہم صحافتی اصولوں کو مد نظر رکھ کر آزادی صحافت اور حقائق کو سامنے لانے پر کاربند ہیں۔ کیونکہ ہم صحافت کی روح کو سمجھتے ہیں۔ اور ہر طرح کی مشکلات و کٹھنائیوں کے باوجود خود کو صحافت کے میدان میں سرخرو پانے میں کامیاب ہیں۔

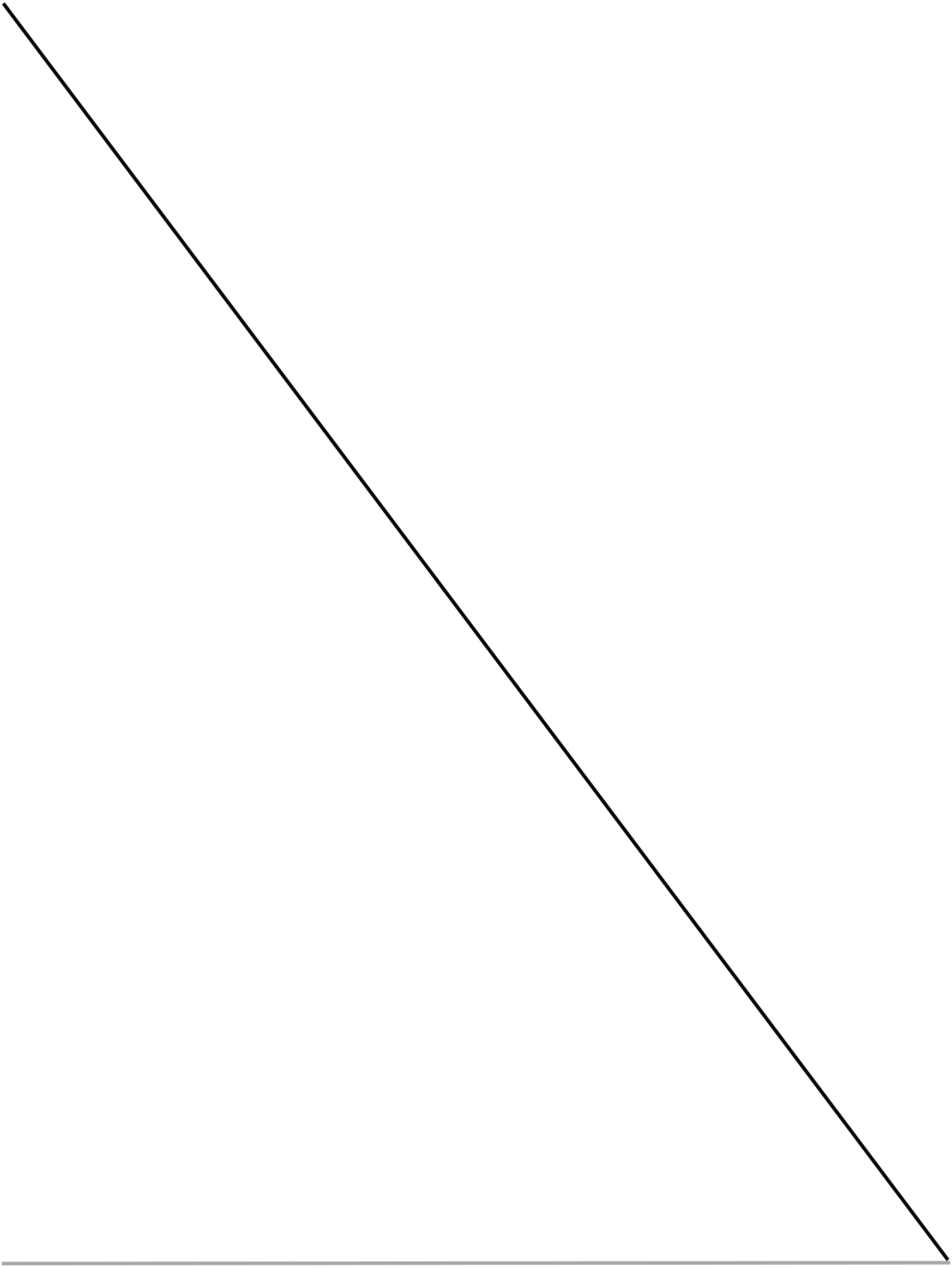

Bibliography

Adel G. H., Elmi M. J., Taromi-Rad H. (2012) *The Pahlavi Dynasty: An Entry from Encyclopaedia of the World of Islam, London: EWI Press Ltd*

Alikuzai H. W. (2013) *A Concise History of Afghanistan, vol. 14, Trafford Publishing*

Axmann M, (2009) *Back to the Future: The Khanate of Kalat and the Genesis of Baloch Nationalism 1915-1955, Oxford*

Basu D. (2006) *Balochistan and the Line of Evil,* http://www.ivarta.com/colums/ol 061012.htm

Beckwith C. I. (2009) *Empires of the Silk Road, Princeton: Princeton University Press*

Beenstock M. (2007) The Rise, Fall, and Rise again of OPEC, in *Economic Disasters of the Twentieth Century, edited by M. J. Oliver and D. H. Aldcroft, Cheltenham: Edward Elgar Publishing*

Breseeg T. M. (2004) *Baloch Nationalism: Its Origin and Development, Royal Book Company*

Baloch, S. (2007) *The Balochistan Conflict: Towards a Lasting Peace, Pakistan Security Research Unit (PSRU), Brief Number 7*

Baloch I. (1987) *The Problem of Greater Balochistan – A Study of Baloch Nationalism, Stuttgart: Steiner Verlag Wiesbaden Gmbh*

Brownmiller S. (1993) *Against our Will: Men, Women, and Rape, Ballantine Books*

Dashti N. (2012) *The Baloch and Balochistan, Trafford Publishing*

Eriksen T. H. (2007) *Globalization, Oxford: BERG*

GlobalSecurity.org - *India-Pakistan Partition 1947*

Human Rights Commission of Pakistan (HRCP - 2011) *Balochistan Blinkered Slide into Chaos: Report of an HRCP fact-finding mission*

Harrison S. S. (1981) *In Afghanistan's Shadow: Baluch Nationalism and Soviet Temptations, New York, Carnegie Endowment for International Peace*

Karimzadi S. (2015) *Methodology of Deception, London: Humgaam Press*

Karimzadi S. (2015) *Dialectic of Regressive Errors, London: Humgaam Press*

Ludington Daily News (26 April 1926) *Persian Hostler now Rules Country – Reza Khan Pehlavi Crowned Shah Sunday was Premier-Dictator*

Payne R. (1973) *Massacre: The Tragedy of Bangla Desh and the Phenomenon of Mass Slaughter throughout History, New York, Macmillan*

Rehman, A. (2010, Nov 19) Revisiting the Che Guevara-Like Days of Baloch Resistance Movement with Asad Rehman, *The Balochhal*

Rummel R. J. (1994) *Death by Government, Transaction Publishers*

The Foreign Policy Centre (2006) *Balochis of Pakistan: on the Margins of History, London*

www.globalsecurity.org/military/world/war/indo-pak-partition2.htm:

www.independent.co.uk/news/world/middle east - Friday 26 Feb 2016

Shahzavar Karimzadi July 2016

Usurping one's land and home by the force of guns does not create legal titles. Indian and Chines fought a just war against their colonisers precisely to recover their claim over their homeland. The Baloch are doing the same and would certainly be victorious in the end.

Of course, Baloch do welcome any foreign investment in Balochistan that improves the well-being of the Baloch people. In contrast, these two deals seriously undermine every conceivable right of the Baloch. Baloch are fully conscious of the strategic location of their homeland and its historical economic potential. Any economic deal must be signed with the representatives of an independent, democratic Balochistan in an open and transparent environment. Above all, economic deals must be open to all potential candidates worldwide. The deals must be mutually beneficial and insure the best interest of Baloch and Balochistan. It is only then that contracts can have legal validity in the eyes of the Baloch nation.

Within a framework of a colonised setting, the terms such as development and economic prosperity become very misleading. What has become of economic development of the entire population of native America in the American context? Christopher Columbus (1451-1506) colonised the new world in 1492. Has there been any economic development in that context? Certainly, there has. But at whose cost? What happened to the Native Americans? Most perished in the hands of their colonisers. Those few who survived have been marginalised to such a point that have never recovered and still live in the worst conditions. In the same way, this is what has happened to the Australian Aborigines. The British conquered and colonised Australia in 1791. Has Australia developed since then? It certainly has. So what has happened to Australian native people? They have encountered the same fate as the Native Americans.

This is exactly the same destiny that Punjabi jihadist and Persian fundamentalists have in mind for the Baloch nation and Balochistan. For the colonialists human life of native populations have no value. What matters is the survival of their colonial states and their affluence. The fact is these deals will never succeed because these colonial geopolitical structures are on their last legs. If they succeed, for the sake of argument, Baloch fate is not going to be different from the Native Americans or the Australian Aborigines.

Conclusion

History is advancing forward and fast. The pace of change is incredible. The underlying currents show a desire for greater freedom; democracy, human rights, open and democratic governments. Medieval colonial theocratic states cannot survive for long given the current state of affairs. The Islamic state of Pakistan, headed by a Punjabi jihadist army, and the Islamic state of Iran, headed by Persian Hezbollah, are among the last political structures of an old world system. These artificial political structures have exhausted their armaments. It is just impossible for these states to sustain the same degree of repression and bigotry for too long. Their collapse and disintegration is inevitable.

Baloch are aware of their democratic rights, the strategic location of their homeland and its economic potential. They will never allow the colonising states of Pakistan and Iran to succeed in implementing such deals fully. As stated earlier these states cannot exist for long given the current climate. Therefore, it is not in the long-term interest of China and India to involve themselves in deals and contracts with these theocratic colonised states. In addition, it is not in the interest of democratic western governments, in particular United States, to have these theocratic states strengthen their economic and military positions.

Baloch are the only legal owners of their homeland, Balochistan, and its resources, ports and assets. They have every right to protect and preserve their homeland by all legitimate and moral means. Economic deals are only legally binding if they are signed by the true representatives of the Baloch nation. Otherwise, they are illegal and will result in exploitation of Baloch people and even more bloodshed. Baloch demands are legitimate. They want the removal of all forces of the colonial states from their homeland and want to restore their independence and democratic rights. These deals undermine Baloch freedom and their rights.

they mean to deploy more armed forces i.e. 10,000 more mercenaries to crush the Baloch liberation movement.

Another rising economic and political power in the region is India. While, it has been much slower compared to China in pursuit of its interests abroad, its expanding economy has made external markets necessary in order that India can achieve her long term economic ambitions. Once again Balochistan came to the centre of attention of regional powers. In May 2016 another deal was signed between India, Iran and Afghanistan on something that none of them have a legal right. The Indian Prime Minister, Narendra Modi, met Hassan Rouhani and the Afghan president, Ashraf Ghani in Tehran. The aim of this meeting was to open a trade route from the port of Chabahar, in Iranian occupied Balochistan, to India through Afghanistan. This trade link is believed to create a transit access to Indian exports to the Middle East and Central Asia. At the same time India would have direct access to Middle East gas and crude oil. The Indian president promised to spend about $500 million developing Chabahar port and about $16 billion in the coming years on the infrastructure of a free trade zone in Chabahar.

So what is the fuss? Baloch should be grateful for these generous and altruistic packages of these states! What is missing in these deals is the Baloch nation. Both ports are Baloch ports. They are situated only 45 miles from each other. Both corridors cross Baloch homeland. Besides, both sides of Balochistan are illegally occupied. Western Balochistan was occupied by the Persian army in 1928 and eastern Balochistan was occupied by the Punjabi Muslim army in 1948. Baloch have never recognised the illegal occupation of their homeland and has always fought and will continue to fight for their freedom. The Chinese and Indian nations must understand from their own experience of struggle against colonialism. They must understand that colonised nations would fight to the end to regain their independence.

Any contract that is not signed by democratically elected representatives of a Baloch nation, who are elected in an independent Balochistan, in a free and open general elections is simply illegal. Baloch have every right to oppose such deals as they have no control over their own resources or the deals that are reached with such occupying states. The Punjabi rulers of Pakistan and the Persian rulers of Iran have not got any legal, moral, economic, cultural, historical or any other right on Balochistan. They are foreign invaders and their presence in Balochistan is purely by means of their swords. It is simply ill-advised for any responsible state to enter into negotiation and signed contracts with the worst corrupt, criminal, theocratic states, on something that they have no legal entitlement. These states are at the top of the list when it comes to crimes against humanity and their systematic abuse of the most basic democratic rights of nations under their colonial domination.

Signing such unlawful contracts and literally wasting billions of dollars, at a time when the entire region is burning in the flame from the dark ages (colonial legacies and theocratic totalitarianism), demonstrate a monumental historical misjudgement. It shows a lack of any viable feasibility study about these free trade corridors. Both Pakistan and Iran are classical specimens of the worst kind of colonial geopolitical structure that have ever existed. Only a spark of sanity and democracy will turn these structures into dust once and for all. All nations under these wrenched colonial structures have suffered. At the earliest opportunity they all break away from these tyrannical constructions.

It is not surprising that both these colonial structures are a concoction of the nastiest brand of militarism and theocracy. Their political structures have always been the same. From time to time we have witnessed domination of one regime over another equally despotic regime but never anything else. The colonial theocratic structures are inherently inhumane and undemocratic and without extreme bloodshed, torture, bigotry and corruption cannot last for long. These corridors extend the lifespan of these colonial theocratic states. Their operation do not diminish the extent of their repression and bloodshed but will intensify them. Any responsible and independent journalist and human rights organisation, if allowed to visit these areas in the first instance, would confirm these Baloch fears.

Even if a democratic state like India enters into such a contract with good intentions (with the intent that Baloch would benefit from these contracts), such contracts are problematic. First of all it demonstrates a lack of sufficient study on the matter and secondly good intention does not in itself insure Baloch inherent human and democratic rights. Baloch like any nation, like the Chinses and Indian nations, are entitled to their freedom from colonialism, occupation and to determine their own destiny. In the absence of any consideration of Baloch fundamental democratic and human rights even a well-intended policy can be deployed against the Baloch. The repressive colonial rulers of Pakistan and Iran receive Chinese and Indian capital, expertise and technology to prolong Baloch repression. Accordingly, whoever takes part in these contracts would covertly assist these colonial states in prolonging and intensifying Baloch subjugation.

One thing is clear Baloch land and Baloch ports belong to the Baloch nation. Punjabi and Persian rulers of Pakistan and Iran have no rights to resources and land that belong to the Baloch.

system, twisted and glued them as accessory of their colonial machine.

Losing Bangladesh bewildered the Punjabi rulers. It was after this setback that for a short time they tolerated the elected Baloch government of Atallah Mengal just for a few months. Then Pakistan's Prime Minister, Zulfikar Ali Bhutto, dismissed it. That was the end of Baloch patience. Baloch Sarmachars (freedom fighters) took arms and liberated most of the eastern Balochistan by 1974. The colonial rulers of Iran and Pakistan got united in their effort to reoccupy Balochistan. In the meantime 90,000 Punjabi mercenaries confronted 60,000 Baloch partisans. The conflict resulted in thousands of Baloch being displaced and about 15,000 were killed (Rahman, 2010 - Baloch Hal).

Today there is no unaffected spots in Pakistani occupied Balochistan. The Baloch liberation movement has spread to every corner of Balochistan. Every Baloch family can tell a tragic story of the Pakistani security forces inhumane treatment of a member or members of their family. The army and their jihadist groups target the informed, secular and conscientious Baloch everywhere in Balochistan, particularly, those Baloch who call for their freedom and the restoration of a free, democratic and developed Balochistan. In the last ten years the Pakistani army and their fanatic Sunni groups have killed hundreds of Baloch leaders, from old and young, men and women (Karimzadi 2015a: 114-24). The list of those who are abducted, disappeared and those whose mutilated bodies have been discovered goes into many thousands. For the first time several mass graves were discovered in Balochistan on 17 January 2014 in Tootak, Khusdar. The jihadist Punjabi rulers of Pakistan have also carried out nuclear tests in Balochistan, on 28 May 1998, in the Koh Kambaran range and Chaghai hills. These tests have destroyed the whole area and there have never been any independent assessment of the effects of these nuclear tests on Baloch people and their land, although many have suffered illness and death as a result.

With its rich resources and its strategic location, if Baloch were free (given their tolerant nature and humanist outlook and a culture and desire to work united for common good), Balochistan could have been one of the most prosperous, democratic and tolerant nations in the world. But under Punjabi colonial theocratic rulers, of the Islamic state of Pakistan, Balochistan is one of the most devastated, broken, poverty stricken and violent societies that can be found anywhere in the world. As result of Punjabi colonialism, the vast majority of Baloch people live on the breadline. Baloch have one of the lowest life expectancy rates, and one of the highest child mortality and illiteracy rates in the world (Karimzadi 2015a: 100-14). Under Punjabi colonial rule; corruption, disease, degradation, abuse, depravity and carnage is endemic in Balochistan. Baloch are deprived of any functional infrastructure, education, hospital, transport, industry, and legal, financial, cultural and political institutions. The Baloch language, environment, art, music and culture are systematically vandalised and degraded.

Corridors of Swindlers and Plunderers

These corridors for the Baloch in Balochistan are the corridors of usurpers and robbers. From this brief account of the Baloch experience, under the colonial rule of theocratic states of Pakistan and Iran, it would be utter insanity to expect anything else. The reason that these states' violate the human rights of Baloch in Balochistan is that they believe Balochistan is belong to them (the theocratic states) and not to the Baloch. This claim is as absurd and antiquated as these states in reality are. The Punjabi Muslims and Persians do not own Balochistan. They have illegally occupied Balochistan. This is the heart of the matter. In view of this fact there is a need to examine the true nature of these two corridors.

Let us clarify the central fabrication first. What has been represented as the China-Pakistan Economic Corridor (CPEC) is the Xinjiang-Balochistan corridor. China after a century and half of mayhem and disorder finally attained its relative stability in 1980s. The Chinese endured every horror imaginable; colonisation, war, famine, displacement and a sequence of massacres for over a century (Karimzadi 2015b: 57). After facing such a terrible period, the Chinese people worked hard and have turned their economy into the second largest economy in the world.

The Chinese economy has in recent decades been transformed. The former command economy has lost its grip and has been replaced with one of the least regulated, aggressive forms of market economy. China is a very large nation and its economy has an appetite that matches its size. Naturally, as it grows, its hunger concurrently grows for raw materials, fossil fuels and it requires routes to discharge its outputs and import its cheap inputs. It was in the light of this transformation that the jihadist Punjabi colonisers of Balochistan discovered another channel to exploit Baloch resources and ports. Constructing a trading route linking the city of Kashgar in Xinjiang and Balochistan's deep water port of Gwadar was seen as one of key artery for China to have access to the Persian Gulf; its gas, oil, minerals and markets. In fulfilling this plan China's president, Xi Jinping, visited Pakistan in April 2015. In this visit he met his counterparts, Punjabi rulers of Pakistan and promised to invest $46 billion by 2030 on the route. The Punjabi army, in turn, pledged to deepen their colonial power in Balochistan. By this pledge

blogger in the world to be executed (Karimzadi 2015a: 77-81). The extent of the brutality conducted by the Islamic regime in Balochistan is such that even a regime high official, who was part of the same system and carried out the same policies for over thirty years, could not keep her silence. The vice president for women and family affairs in Iran, Shahindokht Molaverdi in February 2016 admitted that there is a village in Balochistan "where every single man has been executed" by the Islamic regime (www.independent.co.uk/news/world/middle east - Friday 26 Feb 2016). Her admission is true only partially because there are more than one village in Balochistan where most, if not all men, have been executed by the regime.

The legacy of Persian colonialism in both regimes (by the Shah and the Islamic Republic) is dire. It can at best be described as a fusion of captivity, torture, execution, poverty, addiction, unemployment, deprivation, insecurity, illiteracy and disease. The vast majority of Baloch live below the poverty line and extreme personal insecurity. They are not allowed to speak and write in their mother tongue language and practice their cherished moral and culture values. Baloch are barred from having any media, literature, theatre, and cinema. They are systematically prevented from education, in particular higher education. Balochistan under occupation of the Islamic regime has not even one qualified journalist, artist, musician, or scientist. Where are all these talents? All these talents no doubt are there in abundance but are barred from being utilised. There are parts of Balochistan where Baloch cannot simply enter and where the regime is busy extracting resources, exploiting these not for the benefit of Baloch people but for the benefit of the regime and at the expense of the Baloch. No foreigner is allowed to enter Balochistan because the regime fears that they will report the reality of the situation to the outside world. As for independent media, human rights organisations and credible scholars, there is no any sign of them in Balochistan. If the regime spots any sign of such activity by an individual, the fate of that individual is sealed to certain death. To Baloch colonisers Baloch have no identity and no history. In recent years even they have been removing the name of Balochistan from official documents.

The situation in Pakistani occupied Balochistan is equally horrendous. In many respects it is much worse. The Punjabi Muslims have no national identity except their Indian identity. However, they hate their true identity and are likewise totally paranoid of their Islamic national identity! Their type of colonialism is wholly deformed and psychotic. Their political and military establishment is unhinged and demented and their ruling establishment is deranged and hysterical. They are fully aware of their maniac and fleeting existence and for this reason successive rulers of Pakistan have been unfailingly vile and corrupt.

Balochistan under their occupation is a total disaster. To the Punjabi fanatic colonisers, Balochistan is a zero sum game adventure. They have applied this policy since 950s, depriving the Baloch from their resources of natural gas, minerals and precious metals. Nobody actually knows to what extent the exploitation of such resources has taken place, certainly not the Baloch as they have been completely side-lined and have no access to their own resources. The few Baloch who collaborate with Punjabi colonisers are handpicked from the most corrupt individuals in Balochistan. The beneficiaries of the Balochistan bonanza have been the Punjabi army and security forces followed by Punjabi commercial and religious establishments. Sui gas is a well-known case but it is only the tip of an enormous iceberg. From the mid-1950s to-date it is under their control. They extract it, pipe it to the Punjab, sell it and spend the revenue the way the wish. Baloch share of their natural gas is negligible.

The same story goes for other resources and minerals in Pakistani occupied Balochistan. The ruling colonisers decide about everything. The contracts, the selection of their foreign agents and the price that they will sell the Baloch national wealth. The informed and honest Baloch who wants to know what is happening with their resources are mysteriously abducted and disappear. The mutilated bodies of some appear from time to time in desolate parts of Balochistan and as to the fate of the rest nobody knows. Those locations where there is Baloch minerals, precious stones or where gas is extracted Baloch are excluded. These areas are under the total control of the Punjabi army. These are not industrial zones of Balochistan. On the contrary, these are the military zones of Punjabi army of Pakistan in Balochistan. One rather telling example of how Punjabi colonialism works and how it negotiates contracts with China in extracting Baloch minerals without agreement of the Baloch. First of all there is no independent body to oversee such contracts and Baloch people have no say when it comes to how their resources are utilised or contracted out. Furthermore, nobody is held accountable for whatever the Punjabi establishment has done or intend to do. In addition, the Chinese are allowed to extract whatever they can and directly transport the resources from the source to china without agreement by the Baloch.

Eastern Balochistan from the day it was occupied by the Punjabi army in 1948 have never had a day of stability. During the five Pakistani military operations in Balochistan the whole Baloch society, economy, institutions have been severely crippled. Punjabi jihadist venom has intoxicated and paralysed every organ of Baloch society. The regime's security forces have infiltrated all Baloch organisations that cooperate with the

that supported the state of Israel during the 1973 war. This led to world oil prices increasing sharply. The prices were quadrupled within four months (Beenstock 2007).

The oil bonanza boosted the ego of the little emperor. This was the time that the Shah had grand ideas. One of Shah's ostentatious idea was his plan for one of the largest and the best equipped army in the world. Balochistan because of its location fell a prey to this plan. The regime decided to construct their biggest military base in the Middle East in Balochistan. To this effect, they started to build a base in Konarak, which is adjacent to the port of Chabahar. This base was half way to its completion when the regime was toppled in 1979. Nevertheless, Balochistan indirectly benefited from this project. The construction of the motorway between Zahidan, Wash, Iranshir and Chabahar was a by-product of this venture. Balochistan also gained from the economic multiplier effects of the scheme. Part of the money spent on the project were spent in Balochistan, which generated jobs and economic activity that local people could benefit from.

The second event was when the Democrats came to power in the United States. Jimmy Carter was elected as president of the U.S. in 1977. He encouraged the Shah and his followers to open their markets to the global economy and allow people to exercise their civil rights. It meant an integrated single Iranian economy including Balochistan. For this reason we observe some tangible signs of investment in Balochistan from 1977 to the time the regime was toppled in 1979.

Another significant event that forced Iranian rulers to pay more attention to Balochistan's economic development was the victory of the Baloch liberation movement in eastern Balochistan, during 1973-77. Baloch liberated Balochistan from Pakistani occupation in 1974. It was with the help of the Shah's regime that the Pakistani army defeated the Baloch. The Iranian ruling establishment did not wish the same movement taking roots in Iranian occupied Balochistan and for this reason started to pay a little more attention to Balochistan.

The most notable change in Iranian occupied Balochistan, however, took place about four months before and four months after the Iranian revolution. The colonial system operated by the Shah almost lost its grip over Balochistan a few months before it collapsed. A small section of Baloch society took advantage of the relative freedom and capitalised on the movement of goods through free trade. They imported products from Gulf States and then exported them to Persian cities, Afghanistan and Pakistan. This trade continued four months after the revolution and has left an indelible mark in terms of structural transformation on Iranian occupied Balochistan. It took the Islamic regime about four to five months to strengthen its colonial grip on power in Balochistan and with that Baloch lost their freedom to decide what economic activities were most suited to their business environment and their well-being. As soon as the regime completed its grip over Balochistan, the economic activities that were initiated by the private sector were reversed. In Chabahar people protested against the Islamic regime's policy and called for Chabahar to be turned into a free trade zone.

The Iran-Iraq war was another event that attracted the attention of colonial theocratic rulers of Iran towards Balochistan. The regime needed a safer venue for importing goods. The fever of free economic zones and their experience of the war tempted the regime to open their own free trade zones. Chabahar was one of the most obvious candidate for this purpose. Firstly, it offered an excellent strategic location. Secondly, the Islamic ideology had to give priority to economic expediency during war. Chabahar, as a free port, became an economic windfall that the regime could not pass by. The regime's plan was a systematic exploitation. They exported Hezbollahis to Chabahar under the excuse of requiring security personnel or civil servants. Then steadily and systematically usurped the Baloch land and allocated the appropriated land among their cronies. The regime also subsidised their so called investment and turned many of the native Baloch into one that were landless. Thus pushed many Baloch to the margin of their own hometown. Baloch with some savings started to buy their own land at extortionate prices from their Hezbollahi colonisers. As a result, the demography of Chabahar has changed drastically. Only three decades ago the number of non-Baloch in Chabahar were less than hundred individuals but after three decades they comprise a significant percentage of Chabahar's population. If the same trend continues Baloch will be reduced to a minority group in one of their most important ports. The irony is that the cronies of the regime in charge of the port in Chabahar use the port for smuggling goods to get rich quick. At the same time they have been executing large numbers of the dispossessed Baloch on daily basis under the same pretext.

Under the Islamic regime of Iran Baloch have experienced one of the worst times in their history. The regime rule in Balochistan is a shoot to kill policy. They kill anyone they suspect at any time they wish. Within a year and half of being in power, the regime literally wiped out almost the entire educated section of Baloch society. Tortured and killed the best of what Baloch had and sent the rest into exile. The highest rate of execution per population in the world was in Iranian occupied Balochistan from 2004 to 2009. The regime executed Baloch journalist, Yaquob Mehrnehad in 2008. He was the first web

2007: 7-13). The most important are a massive expansion of international trade, technological revolution, in particular in the information technology, internet, satellite communication, globalization of financial markets and institutions, privatization of nationalized industries and deregulation of markets, the collapse of the Soviet Empire and the economic growth of the emerging economies such as in China and India.

Empire and the economic growth of the emerging economies such as in China and India. That being said globalization is merely an external influence to the nations on the margin. The source of dynamism of the economy of any nation, first and foremost, depends on primary factors of production, land and labour. Without land there is no economy and without people to work we have no economy. The rest are secondary matters. Skills, education, training, institutions, technology, law, markets, science, capital, security, accountability and so on are very important but they are only secondary issues.

The point cited above is very important in the case of Balochistan. It is futile to expect economic development for Baloch when their homeland is appropriated. We will return to this subject towards the end of this article. For now let us look at some internal and external economic facilitators of economic transformation. One source could be the discovery of rich fossil fuels fields, minerals and precious stones. If they are found rich in quality and rarer in quantity, the extraction of such sources can drastically transform the economy of that nation. The case in point is the Gulf States with their huge crude oil reserves. In a relatively short time period their entire economies were transformed and integrated to the global economy.

The silk was produced in China and was transported to Europe crossing these regions. The Silk Road created unintended opportunity for those nations that happened to be on its route.

Occasionally it happens that unintended economic activity of one region would directly affect another region and hence transform that region. One good example of this instance was the nations that were located on the Silk Road (Beckwith 2009). These nations, all the way from China (Xian) to central Asia, from Kashgar to Samarkand prospered because silk was transported and traded on this route. The silk was produced in China and was transported to Europe crossing these regions. The Silk Road created unintended opportunity for those nations that happened to be on its route.

In view of what has been said one cannot underestimate the economic potential of Balochistan. Due to its strategic location and being rich in fossil fuels, minerals, precious metals and its long coast line, Balochistan should have been, at least, as developed as Dubai, Singapore or Hong Kong.

The period that I have in mind for Balochistan's lost opportunity is post Second World War, after Balochistan regained her independence from Britain. It was after the war that huge reserves of fossil fuel were discovered in Middle East, most specifically around the gulf region. The two most significant effects of this discovery were the accumulation of enormous amount of capital in the hands of the Arab states and their citizens from the sale of crude oil. But also associated with this economic prosperity was the immense expansion of international trade in the region. All these took place in close proximity to Balochistan. Have the Baloch benefited from this historical opportunity? The answer is no. Except some Baloch who migrated in search of manual work, Baloch have been barred from taking advantage of this historical circumstance. The agency that has bared Baloch from taking part in this economic development are their colonisers, the state of Iran and Pakistan.

To the colonial rulers, the British, Persian and Punjabis, the Baloch have been restricted from the benefits of their land, its location and resources. Those who live on this land are of no consequence. Balochistan has been exploited by colonial military forces and plundered of its resources to enrich their colonial rulers. There has been a total disregard of the inhabitants of this land and the long term development of Balochistan. This policy of annihilation and vandalism has been predominant and is still applied with greater intensity. Two years before the collapse of the Shah's regime, the foreign minister, Mahmud Khalatbary, made a statement of what the regime thought about Balochistan. He said that the rulers of Iran "always assumed that the Baluch would attempt to create their own independent state some day, with Soviet support, so it was desirable to keep them as politically weak, disunited, and backward as possible" (Quoted in Harrison 1981:159).

Except for a couple of years in the 1970s, the Iranian rulers' policy towards Balochistan has been a policy of devastation and deprivation. The first event that altered this policy towards Balochistan was the 1973, during the Arab-Israeli war. The war instigated the oil embargo against Israel allies that lasted up to 1977. The organisation of the petroleum exporting countries, (OPAC), imposed an embargo against the U.S.A. and the states

context. Mr Chaudari intensely disliked his fellow compatriots, Hindus. With the same degree of intensity he adhered to his sect of Islam. He judged everyone through this narrow prism. In this laid his intention of inventing the jingoistic term, 'Pakistan.' The term Pakistan meant to segregate the Indian 'clean' i.e. Muslims from the Indian 'unclean' i.e. non-Muslim population, in particular from the Hindus. One also must remember when the term was coined it was at the height of the fascist movement in Europe. The Muslim fundamentalists at the time openly defended the fascist ideology.

When the time came for the British to depart from India, the Muslim League, where the adherers of British colonial rule congregated, showed their loyalty to their masters and opposed progressive Indians. With the support and encouragement of the rulers of British Raj they opted for partition of India and the task of partition was given to Louis Mountbatten. The base for the partition were two provinces, the province of Punjab and the province of Bengal. It was decided that west Punjab would form West Pakistan and that east Bengal would form East Pakistan. The so called princely states were then given the choice of either joining Pakistan or India.

Two Boundary Commissions were set up to demarcate the boundary lines. The Boundary Commission of Punjab - the Indian side was represented by Justice Mehr Chand Mahajan and Teja Singh and the western side by Din Mohamed and Muhammad Munir. In case of Bengal, Justice C.C. Biswas and B.K. Mukherji represented the Indian side and Abu Saleh Mohamed Akram and S.A. Rahman the Pakistani side. Cyril Radcliffe (1899-1977) chaired both commissions. Unsurprisingly, the two commissions failed to agree so in the end Radcliff intervened, defined and drew the partition lines.

This was Radcliffe's first visit to India and yet he was given the responsibility of carving up a 'Muslim nation' out of India! The inevitable followed. In the first year of partition it is estimated that about 10 to 12 million people were displaced and about 1.5 million civilians were massacred (GlobalSecurity.org). The partition handed the Punjabi Muslims a country in the name of Pakistan. In a twist of history the most subservient of the British Empire filled the post of the emperor. A new empire, though a very vile and debilitated one, was born in the name of Pakistan. The Punjabi Muslim establishment found themselves in charge of Pakistan's state apparatus.

Thus, Pakistan, one can argue, is just of a fake identity. It is a thick blanket behind which the Punjabi Muslim army, religious and commercial establishments hide their true identity and intentions. The survival of this bogus identity is impossible without an inconceivable amount of state violence; cruelty, Islamic fundamentalism, corruption and its successive sociopath rulers. The entire history of Pakistan bears witness to everything that has been said. So far Pakistan has instigated five major conflicts with India in 1947, 1965, 1971, 1999 and 2001/02. It has also been in constant war with all nations under its occupation, the Baloch, Sindhi, Pashtuns and Bengalis.

Take as an example the east Bengalis, as the co-founder of Pakistan, they comprised a majority in terms of population in Pakistan. In 1971 they won a majority vote in the general election. However, the Punjabi rulers did not want to give up their imperial power, even though their population was less than thirty percent of Pakistan. Bengalis were not allowed to form a government and the Bengalis revolted against this decision. General Yahiya Khan, the President of Pakistan in the February 1971 conference threatened them with the following chilling warning. He told his army to "Kill three million of them and the rest will eat out of our hands" (Payne 1972: 50). What happened next was beyond description. Bengali sources have estimated the victims of the Punjabi army carnage, in east Bengal, within a short period of 267 days, to be about 150,000 people in Khulna, 100,000 people in Dacca, 100,000 in Chittagong, 95,000 in Comilla, and 75,000 in Jessore. The total death toll is said to be about 1,247,000 (Rummel 1994: 331). Susan Brownmiller estimated that between 200,000 and 400,000 Bengali girls and women were raped by Pakistani soldiers during the same period (Brownmiller: 1992).

Clearly, the same rulers have been in charge of eastern Balochistan, Sindh and Khyber Pakhtunkhwa for a longer time. There is one plan that they have for all these nations under their yoke. That is a rigid Islamic fundamentalism like their proxy Taliban government in Afghanistan. In that way these nations stay subordinate to the Punjabi military and religious establishment. One should not be surprised, therefore, to find the footsteps of most of the Islamic jihadist groups in Pakistan. Leaders of these groups are trained and sheltered there. The fanatic mass killer and the leader of al-Qaida network, Bin laden, was found next to their military school in the Punjab on 2 May 2011. Mullah Mohammed Omar died in their hospital and another Taliban leader, Akhtar Mansour, was killed under their protection on 21 May 2016.

In the Midst of the Lost Opportunity

The global economy is changing so fast. Its forces of construction and destruction affected all parts of the world. These changes tend to come with unprecedented opportunities and challenges. The forces that have been behind this transformation are wide-ranging in nature, scope and scale (Eriksen

to the United Nations in 1949 demanding the return of the seized land from the artificially created state of Pakistan (Alikuzai 2013: 584).

Needless to say that the division of Balochistan, into three parts, has seriously undermined Baloch struggle against colonialism. Although the division has undermined the Baloch struggle for independence it has not deterred them from continuing to fight for their right to freedom. These rebellions have continued as they fight to free themselves from their occupiers in both western and eastern Balochistan. Baloch ended the Qajar occupation in 1916 and the British acknowledged that. Bahram Khan became the ruler of western Balochistan. After his death, his nephew Dost Mohammed Khan rose to power. J. Ramsay (25 January 1927) gives a vivid description of this time. He wrote that "there is not a vestige of Persian authority existing, nor has Persia any means of asserting her theoretical claims to sovereignty, over an area in which Persians are aliens and in which they … are detested by the people (Baloch) ... Not only has the country under discussion (western Balochistan) slipped out of Persian grasp, it has been so hostile to Persia" (quoted in Breseeg, 2004: 185).

When Ramsay wrote these words the Persian army was preparing their next military offensive against western Balochistan. In 1928 Reza Khan Mir Panj invaded and annexed western Balochistan to Persia. During the1920s, the Persians occupied the homeland of Turkmen, the Azeri, the Kurds and the Arabs. Reza Mir Panj came to power in a military coup, on 21 February 1921, made himself the prime minister in 1923, and the King of Persia in 1925. Prior to ascending to the throne and achieving power, Reza Mir Panj (1878–1944) was a horse handler or hostler for European commissioners in Tehran (Ludington Daily News: 26 April 1926). He was illiterate and his comprehension of politics stretched as far as "one man" rule (Adel, Elmi and Taromi-Rad 2012: 15).

Occupation and annexation of parts of other nations to Persia, in effect, turned the Persians into minority rulers. Calling the colonial geopolitical structure that Reza Khan constructed, by the use of force, Persia, did not appear fitting. It was very naked conquest, and for this reason, it could not conceal the fact that it was Persian colonialism. In consideration of this fact, in 1934, the Persian rulers changed the name of the country from Persia to 'Iran.' The change of name became official on 21 March 1935.

The term Iran means 'the land of Aryans.' Picking this term was not unintended. The rulers of Persia were close allies of fascist rulers in Germany during 1930s. It reflected the true mind-set of the founder of modern Iran and its subsequent rulers. The term has been an effective tool in camouflaging Persian colonial rule. In truth Iran has remained synonymous with 'Persia' and this identity was officially declared by Mohammad Reza, Reza Khan's son, in 1959.

Despite their continuous political and armed struggle, Baloch in Eastern Balochistan were kept under British rule until 1947. In eastern Balochistan party politics was first initiated in the 1920s (Baloch 1987: 151-57). Eventually, Baloch succeeded on 11 August 1947 to regain their independence in eastern Balochistan but this independence from Britain only lasted for eight months. A short time later Balochistan was once again invaded, this time by Punjabi Muslim army of the newly formed state of Pakistan, on 26 March 1948. From that day to this very day the bloodshed and Baloch resistance have continued. The Pakistani military has conducted nationwide military operations in 1948, 1958, 1962, 1973-77 and the latest one was in 2002 which is still ongoing (Baloch: 1975 and HRCP: 2011).

But what is Pakistan? Much of the violence, Islamic bigotry, death and destruction that has ensued after creation of Pakistan is as a direct result of what is hidden under this very term. Like any empire, the British Empire, had no desire to leave willingly its crown jewel, India. Staying in India was not simply feasible after the war. Britain had to leave. One also must remember that the British Empire ruled India for a long time. British departure naturally put the interests of those Indians who served the British at risk. One part of India that served the British and enforced their colonial policies after 1870s was Punjab. Specifically, those Indians who had converted to Islam under Muslim rule in the west Punjab.

British exploited different religious sects and set them against one another. West Punjab was an ideal ground for this purpose. Therefore, after 1870s Indian Muslim from west Punjab were the main source for recruiting mercenaries in safeguarding the British colonial machine. On the opposite side, the progressive Indians set up a broad based political party - the Indian National Congress in 1885. Those on the side of independence assembled in this party. In order to counter this movement the British set up the All Indian Muslim League in 1906. This party never opposed British rule in India and it is the same party that was rewarded with Pakistan after the Indian partition.

This is how one part of India was hacked off from its body and baptised in the name of Pakistan. The term is in itself alarming to say the least. It was first coined by a fundamentalist Indian Muslim student, Chaudhri Rahmat Ali, at Cambridge in 1933. Pakistan means 'the land of the clean.' Pak literally means clean and Stan means location and land. The true meaning of this term becomes more apparent if we scan it in its historical

The Battle over Balochistan's Ports of Gwadar and Chabahar

By: Shahzavar Karimzadi

Introduction

Balochistan is the homeland of the Baloch nation and it covers approximately 560,000 square kilometres. The strategic location of Balochistan is much-publicised and it has always attracted the attention of global and regional imperial powers. However, increasing integration of the international economy, in the recent decades, has augmented Balochistan's strategic position.

What is often in the news these days concerns the use of Baloch ports. There are numerous small and large ports scattered along Balochistan's 1,200 kilometres of shoreline. The most notable of which are the ports of Gaddani, Ormara, Pasni, Gwadar, Jiwani, Chabahar and the port of Jask. The two Baloch ports that is on the news, more often than not, is the port of Gwadar, which is in the Pakistani occupied Balochistan and the port of Chabahar, which is in the Iranian part of occupied Balochistan.

These colonial lines dismembered the Baloch and Pashtun homelands. Both lines were drawn without the consent of the Baloch and Pashtun nations and hence lack any legal and moral validity

In this article we will shed some light on the disputes surrounding the use of these ports. The narratives offered so far are those disseminated by the colonial states of Pakistan and Iran. Balochistan is neither Pakistan nor Iran. It neither belongs to Iran nor to Pakistan. Baloch is a separate nation. In this article we will first provide a brief background on how an independent Balochistan was illegally occupied and then divided into three parts. In the second part of this article we will look at what we refer to as a nation's lost historical opportunities. The next part of the article will examine some implications of the two trading corridors on the Baloch nation and Balochistan.

Independent and united Balochistan

The Baloch nation had its independent state until Balochistan was invaded by the British Imperial army in 1839 (Axmann: 2009). On the 13 November 1839 the British Army invaded Balochistan. Subsequently, in order to crush the Baloch resistance, the British employed the imperial policy of 'divide and rule' and divided Balochistan into three parts (The Foreign Policy Centre: 2006).

The first line dividing Balochistan into eastern and western parts was the Goldsmid Line. First, the British gave the green light to the Qajar King, Nasir al-Din Shah (1848-1896), to attack and occupy western Balochistan. Following that the Qajar army invaded Bumpur in 1849 and spread their authority over western Balochistan by the beginning of 1870s (Karimzadi 2015a: 26). To close this episode Maj. General F. J. Goldsmid (1818-1909), the chief commissioner of the joint Perso-Baloch Boundary commission, then granted western Balochistan to Persia in 1871.

The second line was drawn in1893. This line is known as the 'Durand Line.' The Line is about 2,450-kilometres long. This line hacked off a chunk of Pashtun homeland to undermine their battle against the British colonisers and annexed it to the British Indian Raj. The task of the dividing the territory was given to the British colonial and civil servant, Henry Mortimer Durand (1850-1924). He dictated his plan to the Afghan leader, Amir Abdur Rahman Khan (1840s-1901). The Afghan leader had no choice but to sign the deal. In 1904 Arthur Henry McMahon (1862-1949), another British Indian officer, extended the Durand Line. That became the final agreement of the Baloch-Afghan border (Dashti 2012: 290). As a result of this line a segment of the northern part of Balochistan was scythed and given to Afghanistan.

These colonial lines dismembered the Baloch and Pashtun homelands. Both lines were drawn without the consent of the Baloch and Pashtun nations and hence lack any legal and moral validity. Not to mention that they are clearly acts which are against international law (Basu 2006). Baloch and Pashtuns have never accepted these lines. In view of the unlawfulness of these lines, the Afghan government sent their representatives

HUMGAAM

Quarterly

April, May, June. 2016

Volume Number : 3rd / Issue Number: 2nd

Published by: Humgaam Press

Address: Noori Naseer Khan Road,

City: Gwadar.

Country: Balochistan.